اردو ادب کی تاریخ

نسیم قریشی

# فہرست

صفحہ

صفحہ



## جدید اردو ادب کے معمار



## جدید اردو شاعری (نظم)

## اردو غزل

## جدید نثر تحقیق و تنقید



## انشائیہ، مقالات، صحافت



## ناول و افسانہ

# اس تالیف کے بارے میں

اردو ادب کی تاریخ ایک مختصر تالیف ہے اور خاص طور پر طالب علموں کی ضرورت کو نگاہ میں رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ اب تک اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مجھے دلی مسرت ہے کہ نہ صرف طلبار بلکہ عام ناظرین نے بھی اسے پسند کیا۔

اردو ادب کے اس مختصر جائزہ میں نہ ادبی رجحانات پر سیر حاصل تبصرہ کی گنجائش تھی، نہ تمام قابل لحاظ ارباب فن کے تذکرے کا امکان میں نے کوشش کی ہے کہ اردو زبان و ادب کے تدریجی ارتقار کا واضح تصور مجمل طور سے نگاہوں کے سامنے آجائے۔

مختصر سی کتاب میں بس اتنا ہی ممکن تھا کہ اس تالیف کے مطالعہ کے وقت قارئین میری مجبوری نگاہ میں رکھیں گے۔

یکم اپریل ۱۹۶۲ء

نسیم قریشی

صاحب باغ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

# اُردو زبان کی پیدائش اور ترقی

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے تاریخ کا ایک بالکل نیا دور قائم ہوا حکومت کے طور طریق میں فرق آیا۔ تہذیب کے خاکے میں نئے رنگ ابھرے۔ رہن سہن رسم ورواج اور بول چال میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ بتدریج ایک نیا تمدن ظاہر ہوا۔ جو زمانے کے ساتھ ساتھ نکھرتا سنورتا اور منظبوط ہوتا گیا اس زبردست اور ہمہ گیر تہذیبی انقلاب کی کہانی بہت طویل اور بہت دلچسپ ہے۔ تاریخ نے اس انقلاب کے انداز رفتار اور اس کے ایک ایک قدم کے تاثرات کو محفوظ کر لیا ہے، بالکل اختصار کے ساتھ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں زندگی کے ایک نئے طرز اور تاریخ نے ایک نئی راہ اختیار کر لی۔

انسانی سماج میں زبان کا بڑا درجہ اور ادب کی بڑی حیثیت ہے سماج میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں وہ زبان وادب میں خاص شان چمک اور اثر کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے کے ساتھ ہندو مسلمانوں میں میل جول اور دوستی و محبت کا جو سلسلہ قائم ہوا اس نے زبان کی بھی نئی تاریخ پیدا کر دی۔ سماجی ضرورتوں نے مسلمانوں کی زبان فارسی اور ہندوستان کی سب بولیوں میں ملاپ کا ایک رشتہ قائم کیا۔ دھیرے دھیرے تاریخ کے ایک زبردست مگر خاموش عمل نے ایک نئی زبان بننے کے سامان پیدا کر دیے۔ نئی بولی کو باقاعدہ زبان

بننے میں سینکڑوں برس کی راہ طے کرنا پڑی۔ یہ زبان مختلف زمانوں اور مختلف خطوں میں مختلف ناموں سے پکاری گئی۔ ہندی، دکھنی، ریختہ اردو معلی ہندوستانی اور اردو سے مختلف نام ہیں۔ اردو کی پیدائش، ابتدائی روپ اور تدریجی ترقیوں پر یورپ اور ہندوستان کے بڑے بڑے محققوں اور عالموں نے اپنے اپنے طرز پر بڑی محنت اور قابلیت سے کام کیا ہے۔ تحقیق نے اس سلسلہ میں معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ مقرر کردیا ہے۔ اردو زبان کی پیدائش اور ترقیوں کے متعلق مختلف نظریئے قائم ہوگئے ہیں اور آج تک برابر تحقیق و تنقید کا سلسلہ جاری ہے۔ ان نظریوں اور وسیع معلومات کے تفصیلی بیان کا یہاں موقع نہیں ہے لیکن ان کی بنیاد پر اردو کی پیدائش، ترقی اور بولی سے زبان بننے تک کے دور کا عام فہم تاریخی تصور با آسانی ابھر آتا ہے۔

قریب چار ہزار برس ہوئے شمالی مغرب کی جانب سے آریہ قوم ہندوستان میں داخل ہوئی۔ آریہ فاتحانہ شان کے ساتھ قدیم ہندوستانی سلطنتوں اور طاقتوں کو پامال کرکے اور اپنی سیاسی طاقت، تہذیب اور دین کی فتح کے پرچم لہراتے ہوئے آگے بڑھے اور مضبوطی کے ساتھ اس زمین پر اپنے قدم جما لیے انھوں نے یہاں کے رہنے والوں کی زندگی، تمدن اور مذہب پر بڑا گہرا فاتحانہ اثر ڈالا۔ وہ خود بھی یہاں کے رہنے والوں سے متاثر ہوئے۔ ان کی زبان نے دیسی بولیوں کے الفاظ، محاورات اور اثرات قبول کئے۔ جس کا اندازہ آریوں کی قدیم ترین مذہبی کتابوں یعنی ویدوں سے با آسانی ہوجاتا ہے۔

## پراکرتوں کا ظہور

لیکن آریوں کی زبان اور دیسی بولیوں کے آزادانہ میل جول کا یہ سلسلہ زیادہ دنوں باقی نہ رہ سکا۔ آگے چل کر برہمنوں نے اپنی زبان کے وقار اور تقدس کو محفوظ رکھنے کے

کے خیال سے ایک اونچے معیار پر اس کی تنظیم کی۔ اس کے لیے بڑے ٹھوس اور بے لچک قاعدے بنائے۔ اور اس کے حاصل کرنے پر بڑی کڑی پابندیاں عائد کیں۔ اس طرح وہ اونچا بھرم اور آن رکھنے والی ادبی زبان پیدا ہوئی۔ جسے سنسکرت کہتے ہیں۔ اور جس کے معنی شدہ اور پاک کے ہیں۔ عوام کی زبان کو پراکرت کا نام ملا۔ جس کے معنی ہیں فطری یعنی ابتدائی حالت کی چیز جو ذہن کی آرائش اور جلا سے محروم ہو، پرانی آریائی زبان ادبی سنسکرت اور پراکرت ~~ــــــ~~ کے باہمی رشتہ پر داد تحقیق دیتے ہوئے ڈاکٹر مسعود احمد حسین خاں صاحب لکھتے ہیں۔ استعارہ میں یہی بات یوں کہی جائے کہ زبان کا جو دھارا آریوں کے وقت سے بہنا شروع ہوتا ہے اس کی ایک شاخ جھیل کی شکل اختیار کر لیتی ہے حسین لیکن محدود جسے ہم سنسکرت کہتے ہیں جس کے ارد گرد اسی کی گرامر کے سنگین ساحل پھیلے ہوئے ہیں۔ اس دھارے کی دوسری شاخ مختلف پہلو بدلتی ہوئی اب تک بہہ رہی ہے۔ کبھی گدلی کبھی تابناک لیکن ہر لحظہ پھیلتی ہوئی ہندوستان کی موجودہ زبانوں کا تعلق براہ راست دھارے کی اسی شاخ سے ہے۔ مختصر یہ کہ آریوں کی ابتدائی زبان (جو کہ دیسی بولیوں کے میل جول سے بنی تھی) ہی سے دید زبان اور سنسکرت پیدا ہوئیں اور دوسری صوبجاتی بولیاں یعنی پراکرتیں بھی پھوٹیں۔ سنسکرت نے صرف چنے ہوئے شائستہ اور بلیغ الفاظ سے اپنا خزانہ بھرا۔ لیکن صوبجاتی بولیوں نے وید زبان کی فطری رجحان کو اپنایا یہی ان کے پراکرت (فطری) کہلانے کا سبب ہے۔ اسطرح ویدک زبان اور پراکرتوں میں سنسکرت کی بہ نسبت زیادہ قریب کا رشتہ دکھائی دیتا ہے اس عمل سے سنسکرت کا ادبی وقار بہت بڑھ گیا۔ لیکن بتدریج وہ پرانی آریائی زبان اور دیسی بولیوں سے الگ اور بلند ہوتی گئی اور آگے چلکر صرف سوسائیٹیوں میں محدود ہو کے رہ گئی۔ عوام کا کام پراکرتوں سے چلتا رہا۔ آج سے ڈھائی ہزار برس پہلے اسی

صورت حال میں ایک زبردست انقلاب آیا۔ جین مت کے مذہبی پیشواؤں نے اور اس سے کہیں زیادہ زور، قوت اور اثر کے ساتھ مہاتما گوتم بدھ نے دین کی ایک نئی تعلیم اور نجات کا ایک نیا راستہ پیش کیا۔ مہاتما بدھ نہ ذات پات کے قائل تھے اور نہ انسانوں کے درمیان اونچ نیچ کے انھوں نے لحاظ، فرق، عام انسانوں سے خطاب کیا۔ اور اسلئے مقصد اپنی تعلیم عام انسانوں کی زبان میں دی تاکہ ہر شخص ان کی بات سمجھ سکے اور ان کی آواز ہر ایک کے دل میں گھر کر سکے بدھ کی تعلیم اور تبلیغ سے پراکرت کا نصیبہ جاگ اٹھا۔ اشوک جس کا نام تاریخ میں امر ہو گیا ہے۔ بدھ مت کا بڑا جوشیلا پیرو تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی مہاتما بدھ کی تعلیم عام کرنے کے لئے وقف کر دی اس تبلیغ کا سارا کام پراکرت کی ادبی شاخ پالی میں ہوا۔ اور اس طرح پالی کو شاندار فروغ حاصل ہوا۔ مہاتما بدھ کی تعلیم نے عام بیداری کی جو لہر پیدا کی تھی۔ صدیوں ہندوستان پر اُس کا اثر رہا۔ مسلمانوں کی آمد سے پہلے بودھ مذہب کا اس زمین سے خاتمہ ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے اثرات کسی نہ کسی روپ میں موجود تھے۔ اس درمیانی زمانے میں پراکرت بھی گرتی پڑتی، اس زمانے کی مار کھاتی پھر بھی سنبھلتی، زمانے کے نئے اثرات کے ساتھ نئے روپ بدلتی، قدم آگے بڑھاتی وقت کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ چھ سو سن عیسوی تک پہنچتے پہنچتے، پراکرت کی ادبی شاخوں اور عوام کی بولیوں میں دوری صاف ظاہر ہو چلی تھی۔ اس دور کے قواعد نویسوں نے عوام کی بولیوں کو اپ بھرنش (بگڑی ہوئی زبان) کہہ کر پکارا ہے۔ پہلے یہ گری پڑی رہی۔ لیکن آخر کار اس کے چہرے پر زندگی کی روشن اور چنچل لہروں نے پڑھے لکھوں کا دل موہ لیا۔ اپ بھرنش کی ترقی کے دروازے کھلے اور راجپوتوں کے دور میں جن کی سیاسی طاقت کے بھر رہے

دہلی اور دوآب کے علاقوں میں لہراتے تھے اس کی ادبی شاخ شورسینی اپ بھرنش کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ راجپوتوں کے زوال کے ساتھ اپ بھرنش کی قسمت کا ستارہ بھی بادلوں میں آگیا۔ ایک ہزار سن عیسوی کے قریب اپ بھرنش کا زوال شروع ہو گیا تھا اور اس کے بطن سے جدید ہندوستانی زبانیں، پنجابی گجراتی، مرہٹی، راجستھانی، بنگالی، اڑیا مشرقی ہندی، بہاری، اور مغربی ہندی جس کی ایک شاخ کھڑی بولی کہلائی جو دہلی اور نواح دہلی میں بولی جاتی تھی۔ اور جس پر اردو کی بنیاد قائم ہے، ابھرنے لگی تھیں یہی زمانہ ہے جب مسلمانوں کے فوجی لشکر اور مسلمان صوفیوں کے قافلے شمالی مغربی راستوں سے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ہندوستان کی زندگی میں ایک انقلاب آگیا جدید ہندوستانی زبانیں نئے انداز اور نئے اثرات کے ساتھ بننے لگیں اور اردو کی پیدائش اور ترقی کی تاریخ کا آغاز ہو گیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ہندوستان کے مالابار اور کارومنڈل کے ساحلی علاقوں سے عربوں کے تجارتی تعلقات بہت پرانے چلے آرہے تھے عرب کے اسلام قبول کر لینے کے بعد بھی یہی تعلقات قائم رہے دکن میں عرب نسل کے مسلمان آج بھی آباد ہیں اور ساحلی علاقوں کی زبانوں میں عربی الفاظ اس شان کے ساتھ موجود ہیں کہ اب وہ بالکل یہیں کے ہو گئے ہیں۔ فاتح کی حیثیت سے مسلمانوں کا پہلا قافلہ بنو اُمیّہ کے مشہور جنرل محمد بن قاسم کی سرداری میں ٧١٢ء میں آیا یہ مسلمان عرب تھے ان کا تمدن عربی تھا۔ انہوں نے سندھ میں اپنی حکومت قائم کرلی جو کئی سو برس قائم رہی۔ عربوں کے اثر سے موجودہ سندھی زبان پیدا ہوئی جو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور جس میں سینکڑوں عربی اور فارسی کے الفاظ شامل ہیں۔ عرب سندھ کے آگے نہ بڑھ سکے وہ ایک خطہ میں محدود ہو کر رہ گئے۔ اور ہندوستان کی عام زندگی اور ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہوا۔ لیکن گیارہویں صدی عیسوی شروع ہونے

سے تین برس پہلے محمود غزنوی نے ہندوستان پر فاتحانہ حملوں کا سلسلہ شروع کیا اس نے پورے ملک کی تاریخ بدل کر رکھ دی تبدریج راجپوت خاندانوں کی طاقت پامال ہوگئی۔ ہندو اقتدار کا خاتمہ ہوگیا اور ۱۲۰۶ء میں مسلمانوں کی ہندوستان میں باقاعدہ سلطنت قائم ہوگئی اور بڑے استحکام کے ساتھ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے تک قائم رہی۔ یہاں تک کہ زمانے نے ایک نئی کروٹ لی ایک نیا رنگ بدلا ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے دہلی کے لال قلعہ سے اس کا پرچم گرادیا اور انگریزی راج کی بساط بچھادی آٹھ سو برس کا یہ زمانہ بڑی تاریخی تبدیلیوں اور ترقی کا زمانہ ہے اس دور نے ہمیں قطب مینار، لال قلعہ اور تاج محل دیا۔ اسی دور نے چشتی کبیر اور نانک کا روحانی پیغام دیا۔ اسی دور نے بھارت کے نئے سنگیت کو جنم دیا۔ اور اسی دور کے تہذیبی میل جول اور تمدنی ترقی نے اردو خاکہ بنایا۔ اس میں ادب کے رنگ بھرے اور ایک مستقل اور شاندار زبان کی حیثیت سے آنے والے دور میں اس کی زندگی اور ترقی کی راہ مقرر کردی۔

غزنی کے ہمراہی اور اس کے بعد کے آنے والے مسلمان، فارسی زبان اپنے ساتھ لئے ہوئے آئے تھے۔ عربوں کی فتح ایران، اور عربی کے ہمہ گیر اثر نے فارسی کو نیا رنگ وروپ، نیا نکھار اور ادبی آرائش کے نئے زیور دیئے عربی کے بعد ہی فارسی اسلامی دنیا کی سب سے زیادہ طاقتور اور باثر زبان تھی مسلمانوں کے ساتھ ہی فارسی ہندوستان میں آئی، ہندوستان میں مسلمانوں کے قافلے کا پہلا قیام پنجاب میں ہوا۔ اس لئے کہ پنجاب کو غزنیوں نے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا۔ محمد غوری کے حملے تک، قریب دو سو برس کا زمانہ زبان کے نقطہ نظر سے خاص اہمیت رکھتا ہے، پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے اسی دور میں یہاں کی زبان حاصل کرنا شروع کردی تھی۔ مسعود سعد سلمان جو اس دور کا اچھا

شاعر گذرا ہے اس کے متعلق تاریخوں میں مذکور ہے کہ اس نے فارسی اور ترکی زبان کے علاوہ ہندی زبان میں بھی دیوان مرتب کیا۔ اس زمانے میں اسلامی دنیا کے نامور عالم محقق اور مفکر علامہ البیرونی نے بڑی محنت، جانفشانی اور سچے ذوق کے ساتھ ہندوؤں فلسفہ، مذہب اور علوم سے اتنی گہری واقفیت حاصل کرلی کہ ان کی کتاب "الہند" اس موضوع پر بڑی مستند اور حیرت انگیز تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ علم کی پیاس بجھانے کے لئے البیرونی کو پنڈتوں کا کھیں نیا کہ برسوں مندروں اور مذہبی خانقاہوں کی خاک چھاننا پڑی تھی اس سے باآسانی یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ مسلمانوں کے علم دوست طبقہ میں ہندوستان کی تہذیب اور علم وفن سے باخبر ہونے کی سچی پیاس روزِ اول سے پیدا ہوگئی تھی۔ ہندو اور مسلمان کو ایک دوسرے سے واسطہ پڑا تو بہت جلد ایک قوم کے الفاظ دوسری قوم کی زبان پر چڑھنے لگے۔ فردوسی کے شاہنامے میں لفظ "کوتوال" موجود ہے جو ہندی لفظ کوٹ والا کو اپنایا ہوا روپ ہے۔ حکیم سنائی کے یہاں لفظ "پانی" ایک شعر میں استعمال ہوا ہے راجہ پرتھوی راج بار اسو کا بیشتر حصہ جعلی ثابت ہوچکا ہے لیکن بعض حصوں کی صحت وقدامت آج بھی مسلم ہے۔ اس کے یہاں بہت سے عربی فارسی الفاظ ہندی کے تلفظ سے ملتے ہیں۔ مثلاً سوار، عربی، ترکی، کمان وغیرہ ان مثالوں سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ عوام کی زبانوں پر الفاظ کا لین دین بڑی تیزی سے شروع ہوگیا تھا۔ اور نئی زبان کا بالکل ابتدائی روپ بننے لگا تھا

سنہ ۱۱۹۲ء میں سلطان محمد غوری نے راجہ پرتھوی راج کو شکست دے کر راجپوت اقتدار کا خاتمہ کردیا۔

اور سنہ ۱۲۰۶ء میں سلطان قطب الدین ایبک نے شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک مضبوط حکومت قائم کردی

پایہ تخت تھا اور پنجابی علاقوں کے مسلمان فوجی فارسی آمیز پنجابی کو لئے ہوئے دہلی آگئے۔ سلطنت قائم ہونے سے مسلمانوں کا قیام زمین ہند پر یقینی ہو گیا۔ اور اب ہندو اور مسلمانوں کے درمیان زیادہ گہرے اور وسیع تر پیمانے پر تعلقات قائم ہونے کے لئے زمین ہموار ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شورسینی اپ بھرنش کی شاخ مغربی ہندی سے برج بھاشا اور کھڑی بولی کی کونپلیں نکل آئی تھیں۔ دہلی میں مسلمانوں کے قیام کے ساتھ دیسی بولیوں میں فارسی بڑی تیزی سے شامل ہونے لگے اور مسلمان بھی یہاں کی بولیوں کے مزاج کو زیادہ بہتر پہچاننے لگے۔ اور ان بولیوں میں مہارت حاصل کرنے لگے فارسی اور دیسی بولیوں سے مل جل کر بننے والی زبان میں جو آگے چل کر اردو کہلائی، برج بھاشا، کھڑی بولی، پنجابی، راجستھانی وغیرہ زبانوں کے اجزا شامل تھے لیکن دھیرے دھیرے یہ کھڑی بولی سے قریب تر ہوتی گئی۔ اور اپنی ترقی یافتہ صورت میں یہ زبان کھڑی بولی کا صاف ستھرا اور شستہ ادبی روپ ہے۔ اردو کی بناوٹ میں کھڑی بولی کو بنیادی اہمیت حاصل ہونے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ دہلی کے بادشاہوں کی فوج میں انبالہ، کرنال، حصار، اور میواڑ کے علاقے سے بھرتی کی جاتی تھی اور چونکہ ان خطوں میں کھڑی بولی کا چلن تھا اس لئے اس کی مرکزی حیثیت روز بروز تیزی کے ساتھ قائم ہوتی جا رہی تھی۔ کھڑی بولی دہلی کی زبان تھی جو ہندوستان کا پایہ تخت تھا۔ یہاں کی ہر چیز کو اقبال مندی اور عزت حاصل تھی۔ اور تمام ملک دہلی کے تمدن اور زبانوں سے گہرے طور پر متاثر ہو رہا ہے۔ شاہان دہلی، فوجوں، تاجر پیشہ لوگوں اور عام انسانوں نے اس زبان کو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلا دیا۔ اور بتدریج اس کا عام رواج ہو گیا۔

یہ اردو کی پیدائش اور ابتدائی ترقی کا مختصر خاکہ ہے مسلمانوں کے دور حکومت

کی تاریخ میں اس خاکہ کی تفصیل ملتی ہے۔ اور وہ صورتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ جو مختلف زمانوں میں اردو نے اختیار کی ہیں۔ اردو کے سلسلے میں امیر خسرو کا نام بڑی اہمیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ خسرو بہت بڑے شاعر۔ زبانوں کے عالم اور موسیقی کے ماہر تھے۔ ان کی طبیعت میں قیامت کی اپج تھی۔ اور نئی نئی چیزیں نکالنے کا انھیں بڑا شوق تھا۔ ہندوستان کی زبانوں سے واقف ہونے کا حال خود انھوں نے اپنے قلم سے لکھا ہے۔ ان کا یہ بھی بیان ہے کہ ہندی میں انھوں نے ایک دیوان تیار کیا تھا۔ ان کے نام کے ساتھ سینکڑوں پہیلیاں، کہہ مکرنیاں اور کہاوتیں منسوب کردی گئی ہیں لیکن مشتبہ ہیں۔ اسلئے اس دور کی زبان کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے ان چیزوں پر بھروسہ نہیں لیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس سے نئی زبان کو بڑھنے اور پھیلنے کا قیاس آسانی سے ہو جاتا ہے۔ خسرو کی فارسی مثنویوں میں ہندی کے کچھ ٹکڑے ملجاتے ہیں جنھیں دیکھ کر زبان کا مزاج آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ تحقیق کرانیوالے غالباً تاریکی میں بھٹکتے رہتے لیکن صوفیوں کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس راہ میں روشنی دکھائی ہے۔ بڑے صوفیوں کے ملفوظات میں ہندی کے فقرے اور الفاظ مل جاتے ہیں۔ جن سے زبان کی ترقی کا گر سمجھ میں آنے لگتا ہے۔

اردو کے عام طور پر پھیلنے اور دور دور کے علاقوں میں اس کی اشاعت میں مسلمان صوفیوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اللہ والوں کا یہ گروہ، مایا کے موہ میں ڈوبے ہوئے دنیا پرستوں کو سچائی اور نیکی کی راہ دکھانے کے لئے آیا۔ ان کا سلسلہ قطب الاقطاب حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ سے شروع ہوا۔ اور بہت جلد یہ روحانی برادری ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ ان کی خانقاہیں دربار عام تھیں۔ جہاں چھوٹے بڑے، غریب امیر، عالم جاہل کا کوئی امتیاز نہ تھا

بڑوں سے زیادہ چھوٹے گرے پڑے زمانے کے ستائے ہوئے انسان کی طرف جھکتے تھے عام انسانوں سے قریب ہونے اور اُن کے کانوں تک اپنی سچائی کا سندیسہ پہنچانے کے لئے صوفیوں نے دیسی بولیاں سیکھیں۔ خواجہ کے متعلق یہ مستند روایت موجود ہے کہ وہ ہندی میں بھی بات چیت کیا کرتے تھے۔ اور حضرت گنج شکر کے دو فقرے ہندی کے مولانا سید مبارک کی کتاب "سیر الاولیاء" میں موجود ہیں ایک فقرہ یہ ہے کہ "پونم کا چاند بھی بالا ہوتا ہے"۔ گنج شکر کے کچھ منظوم اقوال بھی ملتے ہیں۔ شاہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی "خیر المجالس" میں اردو کا ایک فقرہ آیا ہے "تو میرا گسائیں، تو میرا کرتار، مجھ اس تاپ تھیں چھڑالا یعنی تو میرا مالک، تو میرا کارساز، مجھے اس بخار سے نجات دلا۔ شیخ بو علی شاہ قلندر نے ایک موقع پر ایک دوہا پڑھا۔ جس سے اس زمانے میں زبان کی کیفیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

دوہا یہ ہے:۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے

بدھنا ایسی رین کر کہ بھور کدھی نہ ہوئے!

تاریخ فرشتہ میں شاہ نصیر چراغ دہلوی کا ایک ہندی فقرہ ملتا ہے جو انھوں نے شیخ عثمان سے کہا تھا۔ "تم اوپر، وہ تل" یعنی تم اوپر وہ نیچے ان کے علاوہ مختلف صوفیوں کے بہت سے ٹکڑے اور فقرے ملتے ہیں۔ جو زبان کے مزاج کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً لو ہے۔ یا لکڑی یا پتھر کیلا ہے۔ پڈہ ڈوکرے نیچی بیری۔ ہر کوئی جھولے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں حضرت گنج العلم، حضرت گیسو دراز اور دوسرے صوفیا نے اس زبان میں رسالے تصنیف کرنے شروع کر دیئے تھے۔ صوفیوں کی خدمات سے اردو زبان کی یہ

مقبولیت اور عام معیار کی ایک عام اندازہ ہو جاتا ہے۔

پندرھویں اور سولھویں صدی میں دو بڑے مشہور مذہبی ریفارمر سنت کبیر ابا گرو نانک عالم ہندوستان کے دل و دماغ پر چھا گئے۔ کبیر اور گرو نانک کا مستند کلام شائع ہو گیا ہے۔ کبیر ضلع بستی کے رہنے والے تھے۔ وہ بے لوث عبادت اور سچی روحانیت کا پیغام لیکر اُٹھے تھے۔ انکے دوہے آج بھی خاص و عام کی زبان پر جاری ہیں۔ اور دکھے دلوں پر مرہم کا کام کرتے ہیں۔ نانک نیکی اور پاکبازی کا نور بن کر پنجاب کی زمین سے اُبھرے۔ ان کی روحانی آواز نے خدا پرستی اور کھری انسانیت کا عام پرچار کیا۔ کبیر کا بیشتر کلام پوربی میں ہے جو اُن کے دیس کی زبان تھی۔ نانک کی روحانی آواز پنجابی کے قالب میں ظاہر ہوئی۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کے کلام میں دو چیزیں خاص طور پر نگاہ میں رکھنے کے قابل ہیں۔ اول یہ کہ دونوں کے یہاں رائج الوقت عربی اور فارسی الفاظ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ دوم یہ کہ ان دونوں کے کلام میں کھڑی بولی کے نمایاں اثرات ہیں اور خالص کھڑی بولی میں دوہے ملتے ہیں۔

"کبیر کی کھڑی بولی"

کبیر لوٹتا ہے تو لوٹ لے رام نام ہے لوٹ
پھر پاچھے پچھتا ہو گے پران جائیں گے چھوٹ
کبیر کہتا جات ہوں سُنتا ہے سب کوئے
رام کہے بھلا ہوئے گا نہیں تر بھلا نہ ہوئے

نانک کی کھڑی بولی۔

آوت کو جاتا کہیں جاتے کو آیا
پر کی کو اپنی کہیں، اپنو نہیں سمجھایا

میٹھے کو کڑوی کہیں کڑوے کو میٹھا
رائے کو نیندا کر نہیں ایسا کل ماہی دیٹھا

کھڑی بولی کو جو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اس پر سب سے زیادہ حیرت انگیز روشنی مہاراشٹر کے مشہور شاعر اور بھگت نام دیو کے کلام سے پڑتی ہے جس نے کبیر اور نانک سے پہلے قدیم کھڑی بولی میں دوہے کہے۔

مائی نہ ہوتے باپ نہ ہوتے، کرم نہ ہوتا کایا
ہم نہیں ہوتے۔ تم نہیں ہوتے کون کہاں تے آتا
چندان نہ ہوتا سور نہ ہوتا پانی یوں ملایا۔!
شاستر نہ ہوتا وید نہ ہوتا کرم کہاں تے آیا

کھڑی بولی کی اس ابھری ہوئی مرکزی حیثیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے صحیح فرمایا ہے کہ "اس عہد کے مذہبی پیشواؤں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ احساس ہو گیا تھا۔ کہ ان کا عالمگیر پیغام ایک عالم گیر زبان میں ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ نامدیو نے مرہٹواڑہ میں کبیر داس نے پورب میں اور گرو نانک نے پنجاب میں۔ بیٹھ کر لشکریوں اور بیوپاریوں کے ذریعہ پھیلتی ہوئی اس زبان کو اپنایا۔ تاریخ کا یہ جائزہ صاف بتاتا ہے کہ بابر کی آمد کے وقت کھڑی بولی کے روپ میں ہندوستان کی عام زبان (لنگوا فرینکا) کا خمیر پورے طور پر تیار ہو چکا تھا۔ اور ہندوستان کی بولیوں کی کثرت کے درمیان لسانی وحدت کا ایک نیا نقش رفتہ رفتہ ابھر رہا تھا۔

سنہ ۱۵۲۲ء میں بابر نے ہندوستان کو فتح کر کے مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی جو ایک مختصر درمیانی وقفہ کی ساتھ سنہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک قایم رہی مغلوں کا دور ہندوستان کی تاریخ میں بڑی بڑی ترقیوں کا دور ہے۔ تعمیر کے اعلیٰ نمونے

زندگی کے فیشن میں نئی تراش خراش۔ تہذیب کے نئے زیادہ سُنہرے اور ہند و مسلم مذاق کی وحدت ظاہر کرنیوالے نقشے، شائستگی کے نقش و نگار بن کر ظاہر ہوئے اس سنہرے دور میں علم و ادب اور فنونِ لطیفہ کو چار چاند لگ گئے۔ سنسکرت پر خاص توجہ شروع ہوئی۔ اور ہندی کے شاعروں پر بھی انعام و اکرام کی وہ بارش ہوئی کہ وکرماجیت کے دور کی یاد تازہ ہوگئی۔ بابر کی مادری زبان ترکی تھی۔ اور حکومت کی زبان فارسی۔ وہ ہندوستان میں نووارد تھا۔ لیکن دہلی میں بیٹھ کر کھڑی بولی اُس نے اتنی اچھی طرح حاصل کرلی کہ اُس کا شعر ہے۔ سہ

مجکا نہ ہوا کچھ ہوسِ مانک و موتی
فقرا حلیفہ بس بولفو سیتیو پانی و روتی

(مجھ کو مانک موتی لعل و گہر کی کوئی ہوس نہیں ہے۔ فقیر کے لئے ایک ٹکڑا روٹی اور تھوڑا سا پانی کافی ہے۔)

ہمایوں کے دربار میں کچھ فارسی شاعر ایسے تھے جن کے متعلق تاریخیں بتاتی ہیں کہ وہ ہندی میں بھی شعر کہتے تھے۔ ان میں ایک شیخ گدائی کا نام بھی لیکن کلام نہیں ملتا۔ اکبر کے زمانے میں مغل حکومت کا دارالسلطنت دہلی سے آگرہ منتقل ہوا۔ راجدھانی کی اس تبدیلی سے کھڑی بولی اردو کی ترقی کو عارضی صدمہ پہنچا۔ آگرہ کی زبان کھڑی بولی کی بہن برج بھاشا تھی۔ متھرا ہمیشہ خالص ہندو مذہبی تحریکات کا مرکز رہا ہے۔ اس لئے برج بھاشا روزِ ازل سے سنسکرت کے قریب تر رہی۔ اس نے سنسکرت کا سہارا لیکر ادب پیدا کیا اور جب متھرا پندرھویں اور سولھویں صدی میں کرشن بھگتی کی تحریک کا مرکز بنا تو برج بھاشا کے چہرے پر جوانی کی بہار آگئی۔ اور سولھویں صدی سے

اٹھارویں صدی تک برج بھاشا نے واحد ادبی زبان کی حیثیت سے شمالی ہند پر اپنا سکہ جمائے رکھا۔ آگرہ کے مغل دربار میں برج بھاشا کی پہنچ بڑی آبرو اور بانکپن کے ساتھ ہوئی۔ مغل دربار میں برج بھاشا کو ایسا فروغ ملا کہ وہ فارسی سے چشمک کرنے لگی۔ اکبر کے متعلق مشہور ہے۔ کہ اس نے فارسی میں شعر کہے۔ عبدالرحیم خان خاناں کا نام توامر ہو گیا ہے۔ برج بھاشا کی اس شاندار ترقی سے کھڑی بولی کچھ عرصہ کیلئے سایہ میں آ گئی۔ برج کے دامن میں پلٹ کر سنسکرت کے سینکڑوں الفاظ از سر نو چلن پا گئے۔ اور اُن کا یہاں تک پھیلاؤ ہوا۔ کہ دکن کے اس دور کے اردو ادب میں یہ الفاظ کافی تعداد میں موجود ہیں۔ حالانکہ دکنی ادب اردو کی ابتدائی شکل یعنی کھڑی بولی میں ہے۔ اکبر کے زمانہ میں کھڑی بولی کا نمونہ گنگ کوی کی کتاب "چند چھند برن کی مہیما" میں ملتا ہے۔ جو ۱۵۷۲ء میں کھڑی بولی میں لکھی گئی اس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔

"اکبر شاہ جی (بادشاہ) عام کھاس (خاص) میں تخت (تخت) اوپر دراجمان (مسند نشین) ہو رہے ہیں۔ اور عام کھاس بھرنے لگا ہے۔ جس میں تمام امراء آئے آئے کورنش بجانے جہاد کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ جایا کریں"

جب شاہجہاں نے دوبارہ دہلی کو آباد کیا اور تخت شاہی آگرہ سے دہلی منتقل ہوا۔ تو پھر کھڑی بولی کے دن پھرے۔ برج بھاشا بھی دربار کے ساتھ آگرہ سے دہلی آئی تھی۔ لیکن وہ زیادہ دنوں قدم نہ جما سکی۔ اور کھڑی کا روپ روز بروز نکھرتا گیا۔ شاہ جہاں کا دورِ حکومت کھڑی کے حیاتِ نو کا زمانہ ہے۔ اس لئے اردو کو شاہجہانی اردو بھی کہا گیا ہے۔ کھڑی پر انی پنجابی ہریانی اور اپ بھرنشی اثرات کو زائل کر کے اٹھتی ہوئی جوانی کے ولولے اور

ستہ کھڑی سے اردو کی ترقی ہوئی

امنگسد کے ساتھ مشترک ملکی زبان کی حیثیت سے پھیلنا اور فروغ حاصل کرنا شروع کرتی ہے۔ اورنگ زیب کے زمانہ میں اس زبان کو خاص ترقی ملی۔ اورنگ زیب کی سنسکرت دشمنی نے برج بھاشا کے وقار کو سخت صدمہ پہنچایا۔ اور دکن کی فتح نے شمال اور دکن کے درمیان وہ رابطے پیدا کئے جس سے اس زبان کو بڑی قوت اور تیز رفتاری ملی۔ مسلمان شعراء نے اس کی طرف توجہ کی پہلے تو ہندی عروض پر اُسے آزمایا اور بعد میں فارسی عروض کی پابندی کرکے اُسے شاعرانہ اظہار خیال کا ذریعہ بنا لیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام مولانا محمد افضل متوفی ۱۰۳۴ھ ساکن جھنجھانہ ضلع میرٹھ کا ہے۔ جن کے دو شعر درج ذیل ہیں۔

پڑی ہے لگن میں میرے پیم پھانسی | مرن اپنا ہے لوگوں کی ہانسی
مسافر سے جنھوں نے دل لگایا | انھوں نے سب جنم روتے گنوایا

عہد عالمگیر کے مشہور مصنف شاہ سید برکت اللہ پیمی مارہروی نے جو عربی فارسی اور ہندی کے بہت بڑے عالم اور ہندی کے اچھے شاعر تھے۔ چند ریختے بھی لکھے ہیں۔ جن سے اس دور کی زبان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ چند اشعار یہ ہیں۔ ؎

گھر تج کے جا جنگل میں پری تب سمجھ پری
تن من میں پریم کی آگ بری تب سمجھ پری
تکیہ جو مخملی دو گر سیج چھوڑ کے
جب اینٹ زیر سیس دھری تب سمجھ پری

اس سلسلہ میں چندر بھان برہمن کا نام بھی یاد رکھنے کے لائق ہے برہمن شاہجہاں کے دور میں بمقام لاہور ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔

۱۷۴۳ء میں انتقال کیا۔

نمونۂ کلام یہ ہے۔ ؎

خوباں کے باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یاراں
نہ دونا ہے نہ مرداہے نہ سوسن ہے نہ لالہ ہے
پیا کے نام عاشق کوں قتل پا عجب دیکھے ہوں
نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے۔ نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

دلی کی آمد سے پہلے شمالی ہندوستان کی زمین شاہجہانی اور عالمگیری دور میں اردو کی ادب آفرینی کے لئے بالکل سازگار ہو گئی تھی۔ دلی نے ترانۂ سحر چھیڑا ہی تھا کہ ساری فضا رسیلے نغموں سے معمور ہو گئی۔:

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

# اُردو دکن میں

## زبان میں نشو و نما ۔ ادب کا آغاز و ارتقاء

**اُردو کا سفر دکن** ۔ شمالی ہندوستان میں اردو زبان کے آغاز اور زمانہ عالمگیر تک ترقی کی کہانی ہم نے پچھلے باب میں سنائی۔ اب یہ سُنیئے کہ اردو میں باقاعدہ تصانیف کا سلسلہ کہاں سے اور کس طرح شروع ہوا۔ دہلی کی فوجوں اور عام آنے جانے والوں نے اس نئی زبان کو ملک کے مختلف حلقوں اور حصوں میں پہنچایا۔ دکن کی زمین سے پہلے اردو ادب کی پیدائش اور ترقی کے لیے سازگار ہوئی۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے دکن کی خدمات زبان و ادب کی داستان بیان کی جائے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان علاؤ الدین خلجی ۱۲۹۶ء تا ۱۳۱۶ء کے دور میں اسلامی فوجیں فاتحانہ شان کے ساتھ دکن میں داخل ہوئیں۔ خلجی جرنل ملک کافور ہندوستان کے انتہائی جنوبی کنارے تک بڑھتا چلا گیا۔ اور اُس نے ساحل سمندر تک اسلامی فتح کے پرچم لہرا دیے ان فوجوں کے ساتھ دہلی کی کھڑی بولی جو فارسی الفاظ اور اسلوب کی آمیزش سے ایک نیا روپ اختیار کرتی جا رہی تھی، اور لشکروں، بازاروں، منڈیوں اور رعیت کی عام زبان تھی۔ دکن پہنچ گئی۔ دہلی سے تعلقات قایم ہونے کے بعد شمالی ہند سے دکن آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ سپاہی، تاجر پیشہ ور، عام ضرورتمند لوگ۔ جو دہلی سے دکن آتے رہے اس زبان کو تقویت پہنچاتے رہے۔ اور اس کے قدم دکن کی زمین پر جمنے لگے۔ ۱۳۲۶ء میں

۵۶۲۰ ہند ہیں ۔ اسی کا نام "شہادت الحقیقت" ہے ۔ میراں جی کے بیٹے شاہ برہان الدین جانم بڑے صاحب علم بزرگ تھے ۔ انھوں نے روحانی نظموں کے علاوہ غزلیں اور دوہے بھی کہے ہیں ۔ یہ بھی صاحب علم تھے ان کی مشہور کتابیں حسب ذیل ہیں ۔

۱ ۔ وصیت الہادی ۔ ۲ ۔ بشارت الذکر ۔ ۳ ۔ رمز الواصلین ۔ ۴ ۔ ارشاد نامہ سب کتابیں صوفیانہ مسائل اور عقائد سے متعلق ہیں ۔ ان بزرگوں کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے وقت یہ نگاہ میں رکھنا ضروری ہے کہ ان کا مقصد زورِ بیان اور عبارت آرائی نہیں ۔ انھوں نے قلم صرف اسلئے اٹھایا کہ روحانیت کے مسائل کو عام انسانوں تک پہنچا دیں ۔ ان کی زبان دکنی اردو ہے ۔ اور اسکے پڑھنے سے اردو کی ابتدائی شکل نگاہ کے سامنے آجاتی ہے ۔ ہم مثال کے طور پر ان بزرگوں کی تحریروں کے کچھ نمونے پیش کئے دیتے ہیں ۔

"اے عزیز! اللہ بندہ پنا ہیاں پہچان کو جاناچی تو سریع جاتا ہے ۔ اول اپنی پہچانت بعد از خدا کی پہچانت کرنا (معراج العاشقین مصنفہ حضرت گیسو دراز)

"پیغمبر کہے، جے کچھ کام کرے گا کوئی، خدا کا نانوں نہ لے کر تو او کام پائمال ہوگا۔" (مرغوب القلوب مصنفہ میراں جی)

کلام کا نمونہ یہ ہے ۔

اللہ پاک منزہ ذات — اس سو صفتاں قائم سات
علم ارادت، قدرت، باز — سنتا، دیکھتا، بولنہار
حی صفت یہ جان حیات — اس کونا نہیں کہ ممات

ان بزرگوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان

و ادب کی ترقی اور کمال آفرینی کے لئے زمین ہموار کی شاہ میراجی کے سلسلے میں ڈاکٹر عبدالحق صاحب لکھتے ہیں۔

"یہ اسی خاندان کا اثر تھا کہ بیجاپور میں زبان کو اس قدر فروغ ہوا اور وہاں ایسے ایسے خوش بیان اور بلند خیال شاعر پیدا ہوئے جنکی نظیر اردو کے شاعروں میں بہت کم ملتی ہے"

بہمنی سلطنت ۱۳۴۷ء میں قائم ہوئی اور قریب ڈیڑھ سو برس قائم رہی اس کے خاتمہ پر پانچ آزاد سلطنتیں قائم ہوئیں جن میں سے بیجاپور اور گولکنڈہ نے اردو کی ترقی میں ایسا شاندار حصہ لیا کہ تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ان درباروں نے دکنی اردو کی بڑی فیضاضی کے ساتھ مدد کی شاعروں اور ادیبوں کو نوازا اکثر بادشاہوں نے خود بھی شعر و ادب میں کمال دکھایا۔ ان کی ہمتوں کی سرپرستی اور نوازشوں نے ایک عام ادبی فضا پیدا کر دی۔ اور شعر و ادب کا ایک شاندار ذخیرہ فراہم ہو گیا ذیل میں ہم اس دور کے شاعروں اور ادیبوں اور ان کے رنگ شعر و ادب پر روشنی ڈالیں گے تاکہ دکن کی خدمت زبان و ادب کی صحیح تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے۔

# اردو ادب

# عادل شاہی سلطنت میں

۱۴۹۰ء سے ۱۶۸۶ء تک

عادل شاہی سلطنت کا ستارہ اقبال تقریباً دو سو برس تک زمین دکن پر چمکتا رہا۔ اس خاندان نے علم و ادب کی سرپرستی میں وہ فیاضی دکھائی کہ عراق و عجم تک تعریف کی تحسین کا غلغلہ بلند ہو گیا۔ قدردانی و فیاضی نے سینکڑوں

نامور عالموں، ادیبوں شاعروں اور ارباب فن اور کمال کو دربار میں جمع کر دیا۔ فارسی کے ساتھ دکنی اردو بھی خوب چمکتی، ابراہیم عادل شاہ ثانی ۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۶ء جو شہنشاہ اکبر اور جہانگیر کا ہم عصر تھا، بڑے پایہ کا مربی علم و فن تھا۔ سنگیت میں اس نے ایسا کمال حاصل کر لیا تھا کہ اس دور کے استادان موسیقی اسے "جگت گرو" کہا کرتے تھے اس نے فن موسیقی پر ہندی نظم میں ایک کتاب لکھی جس کا نام "کتاب نورس" ہے۔ علی عادل شاہ ثانی کو زبان اردو سے بہت دلچسپی تھی اس کے زمانے میں شعر و شاعری کا خوب چرچا تھا۔ دکنی اردو کے شاعر خوب کثرت سے پیدا ہو گئے تھے۔ بادشاہ ان پر دل کھول کر نوازشیں کرتا تھا۔ دکن کا مشہور شاعر ملک الشعرا نصرتی اسی بادشاہ کا درباری شاعر تھا۔ عادل شاہی دور کے نامور شاعروں میں رستمی ملک، خوشنود، فطرتی، امین، سیوا، ہاشمی اور مرزا خاص شہرت رکھتے تھے۔

**رستمی** —— کمال خاں نام، رستمی تخلص، سلاطین بیجاپور کے دربار میں دارالانشاء کی افسری پر مامور تھا۔ اس نے ۱۰۶۰ھ میں فارسی زبان کی مشہور مثنوی "خاور نامہ" کا ترجمہ اردو نظم میں کیا۔

**ملک خوشنود** —— محمد عادل شاہ کے دربار کا ایک اشعر تھا۔ اس نے ایک مثنوی "بہشت بہت" کے طرز پر لکھی اس کی دوسری مثنوی "یوسف زلیخا" ہے۔ یہ بھی امیر خسرو سے ماخوذ ہے عادل شاہی دربار میں بڑے رتبہ اور حیثیت کا مالک تھا۔ اور بڑا شاعرانہ اعزاز رکھتا تھا۔

**نصرتی** —— اس دور کا سب سے مشہور شاعر ملک الشعراء نصرتی ہے جس کی قادر الکلامی اور بلند پایہ شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف فن ناقدوں نے کھل کر کیا ہے۔ بذلہ سنج، شگفتہ مزاج، صاحب علم و فضل پر حاکمانہ عبور مابہر انداز قادر الکلامی کا جوہر نمایاں، نصرتی نہ صرف دکن کا بہت گراں پایہ شاعر

ہے بلکہ اردو شعر و ادب کی تاریخ ارتقاء اس کی نمایاں حیثیت ہے۔ محمد نصرت نام اور نصرتی تخلص تھا علی عادل شاہ ثانی نے اس کو ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا نصرتی کی سب سے مشہور تصنیف "علی نامہ" ہے اس مثنوی میں اس نے علی عادل شاہ ثانی کے فتوحات بیان کئے ہیں اور نصرتی اسے "شاہ نامۂ دکن" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کی دوسری مثنوی "گلدستۂ عشق" ہے جس میں کنور منوہر اور مالتی کے حسن و عشق کی داستان مذکور ہے اس میں کم و بیش چار ہزار اشعار ہیں۔ غزلوں کے دیوان اور مجموعۂ قصائد کے علاوہ اس کی تصانیف میں ایک نعتیہ قصیدہ بھی شامل ہے جس میں معراج سرورِ کائنات کا اعلیٰ لطافت تخیل میں سمویا ہوا شاعرانہ بیان ہے، نصرتی کا انتقال ۱۶۸۴ء میں ہوا۔

امین ـــــ شیخ امین الدین اعلیٰ جو شاعری میں امین تخلص کرتے تھے۔ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق کے پوتے اور اپنے دور کے بہت بڑے ولی تھے۔ ۱۶۷۵ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کا کلام جسے آپ کے مریدوں نے "جواہر الاسرار" کے نام سے جمع کیا ہے، حقائق عرفان سے لبریز ہے ان کے علاوہ آپ کے قلم سے کچھ رسالے بھی ہیں۔

سیوا ـــــ سیوا کا وطن گلبرگہ تھا۔ لیکن بیجاپور میں رہا کرتے تھے انہوں نے ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف "روضۃ الشہدا" کا نظم میں ترجمہ کیا ہے "قانون اسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں عبادات کے احکامات درج ہیں اس کے علاوہ مرثیے لکھے جن کی بدولت انہیں عوامی مقبولیت حاصل ہوئی۔

ہاشمی ـــــ علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں گذرے ہیں ان کا نام سید میران اور وطن بیجاپور ہے۔ سید شاہ ہاشم علوی کے مرید تھے ۱۶۹۷ء میں اپنے مرشد

کی فرمائش سے فسانۂ "یوسف زلیخا" کو منظوم کیا۔ اس میں چھ ہزار سے زیادہ اشعار ہیں شعر اول ہے۔

سگِ عشق جس کا بوستار ہے
شاہ محمد اس کو مزاوار ہے

یہ مثنوی دکنی لٹریچر میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

**عبدالمومن مومن** ۔۔۔ دور عادل شاہی کے خوش گو شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ۱۰۲۱ھ میں ایک کتاب "اسرار عشق" کے نام سے لکھی۔ اس میں حضرت سید محمد جونپوری کی سوانح عمری اور کرامات کا بیان ہے۔

**مرزا** ۔۔۔ یہ بھی دکن کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔ صرف نعت، منقبت، مرثیے کہتے تھے۔ تمام عمر کسی امیر یا بادشاہ کی شان میں ایک شعر بھی نہیں کہا۔

# اردو ادب
# قطب شاہی دور میں
## ۱۵۱۸ء تا ۱۶۸۷ء

قطب شاہی خاندان کی داستان عروج و اقبال میں اردو کی ترقی ایک شاندار باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس خاندان نے بھی علم و ادب کی سرپرستی میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ بڑے شاعر اور ادیب اور فنون کے باکمال اس کے دامن دولت سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ قطب شاہی سلطنت کی

نواز شوں نے دکنی ادب کے ذخیرے میں اضافہ کیا اور اس کے خزانوں کو قیمتی جواہر ریزوں سے مالا مال کیا۔ اس خاندان کے تین بادشاہ محمد قلی قطب شاہ محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ اردو شعر و ادب کی تاریخ ترقی میں خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں ہم ان بادشاہوں کی ادبی خدمات و نیز ان کے دور کے مشہور ارباب شعر و ادب کا حال اختصار کے ساتھ بیان کرتے کرتے ہیں۔

## محمد قلی قطب شاہ ۱۵۸۰ء تا ۱۶۱۱ء

محمد قلی قطب شاہ قطب شاہی بادشاہوں میں بڑے امتیاز کا مالک ہے۔ اسے فن تعمیر، خوشنویسی، شعر و ادب اور ان کے علاوہ دیگر فنونِ لطیفہ کا بہت شوق تھا۔ وہ شعر و ادب کا بہت بڑا مربی تھا۔ اور خود بھی اعلیٰ پایہ کا شاعر تھا۔ اس کی کلیات زبان فارسی اور دکنی پچاس ہزار اشعار پر مشتمل ہے اس کے علاوہ اس نے تلنگی میں بھی شعر کہے ہیں کلیات میں پہلے مثنویاں ہیں ان کے بعد قصیدے پھر ترجیع بند اور مرثیے، مرثیوں کے بعد غزلیں اور رباعیاں ہیں۔ اس کی زبان میں کافی ترقی اور پختگی پائی جاتی ہے۔ اور اس کے کلام میں ایک خاص ادبی شان ہے۔ اس کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب لکھتے ہیں۔

"چار سو برس پہلے کا کلام اگر آج کل کے شعر کے عاشقیہ کلام کے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو سوائے زبان کے تغیر کوئی اور فرق معلوم نہ ہوگا۔ وہی باتیں ہیں وہی مضمون ہیں اور وہی طرز ادا اور وہی بحریں ہیں۔ اس لحاظ سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام اردو کے کسی دوسرے شاعر سے

کم نہیں ہے۔ عشق و مستی اور تصوف میں اس کا کلام کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا ہے کہ حافظ کے فیض نے شاعر کی طبیعت کو گویا دیا ہے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ایک بات نئی دیکھی گئی ہے۔ جو اردو شعرا میں سوائے سودا، اور نظیر کے کسی دوسرے کے کلام میں نہیں پائی جاتی وہ یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعری کو صرف عشق و محبت، حمد و نعت، منقبت و مرثیے تک ہی محدود نہیں رکھا۔ بلکہ انسانی معاشرت اور مظاہر قدرت پر بھی نظر ڈالی ہے۔ مثلاً متعدد مثنویاں پھولوں، میووں پر ہیں جن میں ایران اور خراسان ہی کے میوے نہیں بلکہ ہندوستان کے ہر قسم کے پھلوں کا بیان کیا ہے۔ دو مثنویاں سبزہ کاری اور شکار پرندوں کے بیان ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سی مثنویاں، غزلیں ایسی ہیں جنھیں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے شاہی محلات مثلاً الٰہی محل، جناں باغ، باغ محمد شاہی اور اسی عہد کے رسم و رواج مثلاً شادی بیاہ کے رسوم سالگرہ کی تقریب، شب برات، میلاد النبیؐ، عید غدیر، ہولی، بسنت وغیرہ پر لکھی ہیں۔ دو نظموں میں صراحی و پیالہ اور کالی گوری کا مکالمہ بیان کیا ہے۔

نمونے کے طور پر ہم اس کے دو شعر لکھتے ہیں:

| | |
|---|---|
| سدا اہل دل ہی و علی کی کہتا ہے | معانی شعر ترا لکھے میں دست ابد |
| خورشید کے اوپر ہے ابر میں ہلال عید | اس ابرو ال کو پور کیا ہے وصال حید |

## محمد قطب شاہ (۱۶۱۱ء تا ۱۶۲۵ء)

یہ بادشاہ بھی علم و ادب کا بڑا قدرداں اور ارباب فن کا بڑا مربی تھا۔ شعر گوئی کا اچھا مذاق رکھتا تھا۔ فارسی اور اردو دونوں میں دیوان موجود ہیں۔ نمونے کے اشعار ملاحظہ ہوں:

پیا سانولا من ہمارا بھولا یا! — نزاکت عجیب سبز رنگ میں دکھایا
ساقیا آ شراب ناب کہاں — چندر کی پیالی میں آفتاب کہاں

## عبداللہ قطب شاہ ــــ ۱۶۲۵ء تا ۱۶۷۲ء

اپنے پیش رو بادشاہوں کی طرح عبداللہ بھی علم و ادب سے گہرا لگاؤ رکھتا تھا ارباب ادب کی بڑی قدر کرتا تھا۔ اور ان پر بڑی داد دہش کیا کرتا تھا۔ فارسی اور اردو دونوں میں اس کے دیوان بھی مشہور رہا۔

آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب پُر — کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث
جب کچھ راز پر۔ وہ بیاں ہیں غیب کے — سو کچھ بھی نہیں اس پر ہیں آشکار

**ملا وجہی** ــــ قطب شاہی دور کا سب سے زیادہ مشہور اور با کمال ادیب ملا وجہی ہے۔ وجہی ابراہیم قطب شاہ کے زمانے میں پیدا ہوئے شعر و ادب کی دنیا میں بڑا کمال حاصل کیا۔ وجہی نے کئی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے دور میں انہوں نے اپنی مشہور مثنوی "قطب مشتری" لکھی۔ اس کا سن تصنیف ۱۶۰۹ء ہے۔ اس مثنوی میں وجہی نے بادشاہ قطب کے عشق کی داستان بیان کی ہے۔ مثنوی میں تقریباً دو ہزار اشعار ہیں اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس دورِ قطب شاہی کے تمدن کی اچھی تصویر ملتی ہے۔ وجہی کو امر بنانے والی کتاب سب رس ہے۔ اس کتاب میں وجہی نے تصوف کے مسائل کو بڑی دلکشی، لذت بیان اور رعنائی فکر کے ساتھ تمثیلی پیرائے میں پیش کیا ہے عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے لیکن بیان کی روانی میں ایک خاص شان ہے۔ "سب رس" اردو نثر کی تاریخ ارتقا میں ایک بہت اہم مقام رکھتی ہے اگر باعتبار رمز و تمثیل دیکھا جائے تو "سب رس" اپنے طرز کی اردو میں پہلی کتاب ہے۔ "سب رس" کا سن تصنیف ۱۶۳۵ء ہے۔ وجہی نے یہ کتاب سلطان عبداللہ قطب شاہ کے حکم سے لکھی۔

**غواصی** ـــ ملا غواصی گولکنڈہ کے باشندے اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کے معاصر تھے۔ ان کی دو تصنیفات موجود ہیں۔ (۱) فسانۂ سیف الملوک و بدیع الجمال اس مثنوی میں سیف الملوک شہزادۂ مصر اور بدیع الجمال شہزادی چین کے عشق کا حال ہے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۳۵ھ ہے (۲) طوطی نامہ یہ مثنوی ضیا بخش کے فارسی "طوطی نامہ" کا اردو ترجمہ ہے۔

**ابن نشاطی** ـــ ابن نشاطی بھی سلطان عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس نے فارسی کتاب "البساتین" کا منظوم ترجمہ "پھول بن" کے نام سے کیا ہے۔ اس کا سن تصنیف ۱۰۶۵ھ ہے ادبی اور لسانی دونوں حیثیتوں سے اس مثنوی کا مطالعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

**ملا قطبی** ـــ شاہی دور کے ایک اچھے شاعر ہیں۔ انہوں نے ۱۶۳۷ء میں مشہور صوفی شیخ یوسف دہلوی کی کتاب تحفۃ النصائح کا دکنی نظم میں ترجمہ کیا ہے۔

**تحسین الدین** ـــ تحسین الدین کی مشہور مثنوی "کامروپ کلا" ہے۔ اس مثنوی کے سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے سب اشخاص قصہ ہندو ہیں۔ اور کہانی کا ماحول بھی ہندوانہ ہے۔ جسے مصنف نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ مشہور جرمن شاعر گوئٹے نے اس کا ترجمہ کرا کے سنا اور بہت پسند کیا۔

آخری قطب شاہی تاجدار ابو الحسن تاناشاہ کے دور میں نوری نامۂ شاہی اور مرزا نے بھی خاص شہرت حاصل کی۔

موجود ہے ولی دکن کے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں اکثر دکنی الفاظ اور ترکیبیں ملتی ہیں لیکن عام طور پر ان کی زبان بہت شیریں اور شستہ ہے ان کے بیان میں ایک مٹھاس اور لذت ہے۔

تصوف اور روحانیت کے مسائل کو انھوں نے بڑے دلکش انداز میں اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے اور اخلاقی مضامین کو بھی بڑے شاعرانہ کمال کے ساتھ اپنی غزل میں جگہ دی ہے۔ ہندی الفاظ کا برمحل استعمال شعر میں بڑا مزہ پیدا کر دیتا ہے ان کے بعض بعض اشعار اتنی منجھی اور ڈھلی ہوئی زبان میں ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے میں لکھے ہوئے ہیں۔ دلی کے کلام میں فارسی کی معنی آفرینی اور بھاشا کی مٹھاس کا دو آتشہ ملتا ہے شمالی ہند کے سفر نے ان کے کلام میں دکنی اثر کو زائل کر کے دہلوی انداز بیان کو نمایاں کر دیا۔ ولی کے قصیدوں میں بھی ایک خاص شوکت بیان ہے سورت کی تعریف میں ایک مثنوی موجود ہے جس میں شہر کی رونق دلچسپیوں اور معاشرت کا بڑا اچھا بیان ہے۔ ولی کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

مجھ کو ہوا ہے معلوم اے مست جام خوبی
تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہوگا!

مسند گل منزل شبنم ہوئی!!
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا!!

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس میں
کرتی ہے نگہ جس قدر نازک پہ گرانی

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا
ہے مطالعہ مطلع انوار کا

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن
باعث خمیازۂ آغوش ہے!!

مثنوی "منطق الطیر" کا ترجمہ "پنچھی باچھا" کے نام سے کیا - وجدی نے عطار کی ایک دوسری مثنوی "گل وہرمز" کا بھی ترجمہ کیا ہے اور اس کا نام رکھا ہے - "تحفۂ عاشقاں" اس کا سن تصنیف ۱۱۶۰ھ ہے - گولکنڈہ اور بیجا پور کی تباہی کے بعد اورنگ آباد جو دکن میں اورنگ زیب کا مرکز حکومت تھا - بڑے بڑے باکمال ادیب و شاعر جمع ہو گئے تھے اورنگ آباد کے نامور شاعروں کی فہرست بہت طویل ہے - ولی اور سراج خاص امتیاز رکھتے ہیں -

**ولی** ــــ ولی کو اردو شاعری کی زبان میں بڑا درجہ حاصل ہے ایک زمانہ تک یہ خیال عام رہا ہے - کہ وہ اردو کے سب سے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں - لیکن دکنی شاعروں کے دیوان مل جانے کے بعد ولی کے سر سے یہ اولیت کا تاج اتر گیا - پھر بھی اردو شاعری میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے ان کے معاصر اور بعد کے شاعروں نے انہیں استاد مانا ہے - اور بڑی قدر و منزلت کے ساتھ ان کا نام لیا ہے -

ولی ۱۶۶۸ء میں بمقام اورنگ آباد پیدا ہوئے - پہلے اورنگ آباد میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد شاہ وجیہہ الدین علوی کے مدرسہ احمد آباد میں تکمیل تعلیم کی اور وہیں اس خاندان کے مرید بھی ہو گئے - ولی کو سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا - وہ عالمگیر کے عہد حکومت میں دہلی آئے دہلی کا سفر ان کی شاعری میں ایک بڑے تغیر کا پیش خیمہ ثابت ہوا - ولی بڑے قادر الکلام شاعر تھے - انہوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مستزاد، رباعیات، ترجیع بند تقریباً تمام اصناف سخن میں اپنی طبیعت کے جوہر دکھائے ہیں - ان کی طبیعت میں روحانیت کا سچا ذوق تھا اور جگہ جگہ ان کے کلام میں اس کی جھلک

موجود ہے ولی دکن کے شاعر تھے۔ ان کے کلام میں اکثر دکنی الفاظ اور ترکیبیں ملتی ہیں لیکن عام طور پر ان کی زبان بہت شیریں اور شستہ ہے ان کے بیان میں ایک مٹھاس اور لذت ہے۔

تصوف اور روحانیت کے مسائل کو انھوں نے بڑے دلکش انداز میں اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے اور اخلاقی مضامین کو بھی بڑے شاعرانہ کمال کے ساتھ اپنی غزل میں جگہ دی ہے۔ ہندی الفاظ کا برمحل استعمال شعر میں بڑا مزہ پیدا کر دیتا ہے ان کے بعض بعض اشعار اتنی منجھی اور ڈھلی ہوئی زبان میں ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانے میں لکھے ہوئے ہیں۔ ولی کے کلام میں فارسی کی معنی آفرینی اور بھاشا کی مٹھاس کا دو آتشہ ملتا ہے شمالی ہند کے سفر نے ان کے کلام میں دکنی اثر کو زائل کر کے دہلوی انداز بیان کو نمایاں کر دیا۔ ولی کے قصیدوں میں بھی ایک خاص شوکت بیان ہے سورت کی تعریف میں ایک مثنوی موجود ہے۔ جس میں شہر کی رونق دلچسپیوں اور معاشرت کا بڑا اچھا بیان ہے۔ ولی کے چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

مجھ کو ہوا ہے معلوم اے مست جام خوبی\
تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہوگا!

مسند گل منزل شبنم ہوئی!!\
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا!!

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس میں\
کرتی ہے نگہ جس قدر نازک پہ گرانی

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن\
باعث خمیازۂ آغوش ہے!!

سراج ـــ آپ کا نام سید سراج الدین تھا۔ اچھے شاعر ہونے کے علاوہ شعری تنقید کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ بڑے روحانی مرتبے کے انسان تھے ان کے خیالات میں بلندی جذبات میں خلوص اور زبان میں بے انتہا صفائی اور سادگی ہے ۱۷۶۳ء میں رحلت ہوئی ان کی سب سے مشہور غزل کے دو شعر یہ ہیں۔ ؎

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی!
نہیں ہوش والوں سے کچھ گلا مجھے رشک ہے تو انہیں پہ ہے
جو نہیں ترے جلوؤں کے سامنے مری طرح بے خبری رہا ہے

ولی کے [illegible] میں غزل گو شاعروں کے علاوہ مرثیہ نگاروں نے بھی شہرت حاصل کی مرثیہ میں نام پیدا کرنے والے ممتاز شاعر یہ ہیں۔ ہاشم علی۔ (۱۶۸۸ء لغایت ۱۷۶۰ء) امامی، امین، گجراتی، غلامی، قادر، اور اشرف۔

# دکنی ادب ۔ ایک تبصرہ

اوپر کے صفحات میں ہم نے عہد بہمنی سے لے کر ولی اورنگ آبادی کی دور تک اردو زبان و ادب کا ایک مختصر جائزہ لیا ہے چار سو برس کے زمانے میں اردو کی حیثیت شمالی ہند میں بولی کے آگے نہ بڑھ سکی۔ لیکن دکن کے اس زمانے میں ادبی تصانیف کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر لیا۔ اس کی اہمیت اسلئے اور بڑھ جاتی ہے کہ دکن میں اردو

کا نشو و نما شمالی ہند کے بعد شروع ہوا۔ اور وہاں بہت جلد اس زبان نے ادبی رنگ اور تفصیلی شان حاصل کر لی۔ دکنی ادب باعتبار زبان اردو کی ابتدائی صورت ہے۔ صدیوں کے تغیرات نے اس دور کی اور اس زمانے کی زبان میں بڑا فرق پیدا کر دیا ہے۔ پھر دکنی ادب میں دکن کی مقامی بولیوں کے گہرے اخراجات بھی ہیں۔ شمالی ہند میں اردو کا ارتقا اس طرز پر ہوا کہ اس کی ادبی شان تمام تر فارسی کی آرائشوں اور زیبائشوں سے قائم ہوئی۔ اس کے برخلاف دکنی ادب میں بھاشا کے الفاظ و محاورات وغیرہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان چیزوں نے دکنی ادب کے بیشتر حصے کو ہمارے لئے نامانوس بنا دیا ہے۔ لیکن اس سے دکنی ادب کی قدر و منزلت میں کوئی فرق نہ آیا۔ دکن کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے اس کی زمین پر اردو ادب پیدا ہوا۔ اور قریب دو سو برس تنہا دکن نے اس کی آبیاری کی۔ اولیت کا شرف، دکنی ادب کی اہمیت کو بہت بڑھا دیتا ہے اس کے مطالعہ سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ملتا ہے کہ اردو زبان کی ابتدائی صورت اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور زبان کے ارتقا کا مزاج اور انداز بھی روشن ہو جاتا ہے۔

یہ چیز کچھ حیرت انگیز نہیں ہے کہ دکن نے زبان ادب کی خدمت بڑے ہمہ گیر ذوق کے ساتھ کی ہے دکنی ادب کا آغاز تصوف کے رسالوں اور صاحب دل صوفی شاعروں کے کلام سے ہوا لیکن بہت جلد شاعری کی تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ترجیع بند اور رباعی، غرض کہ ارباب سخن نے ہر میدان میں فکر و نظر کی جولانیاں دکھلائی ہیں۔ دکن میں ایسے باکمال کے نام ملتے ہیں جنہوں نے مختلف اصناف سخن میں یکساں مشاقی کے ساتھ زور طبیعت دکھایا۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں ہر صنف کی شاعری کا اچھا نمونہ ملتا ہے

ایران اور شمالی ہندوستان کی طرح زمین دکن پر بھی غزل گوئی کا عام رواج تھا۔ قطب شاہی خاندان کے کئی بادشاہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ دکن میں غزل گوئی کا معیار میر۔ غالب اور مومن کے درجہ فکر تک نہیں پہنچ سکا۔ لیکن اس سے دکن کی غزل گوئی بالکل بے وقعت ہو کر نہیں رہ جاتی۔ محمد قلی قطب شاہ کی غزلیں اعلیٰ معیار کی ہیں۔ سراج اورنگ آبادی کی غزل گوئی پاکیزگی زبان اور رفعت تخیل کا ایک اچھا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ رہا ولی اورنگ آبادی تو اس کا شمار تمام ارباب ذوق نے چوٹی کے اردو کے شاعروں میں کیا ہے۔ غزل کی طرح ولی کی قصیدہ گوئی بھی ایک خاص شہرت رکھتی ہے۔ ولی کے تمام قصائد نہایت پاکیزہ روحانی جذبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور ان کے بیان میں بڑا خلوص ہے۔ ملک الشعراء نصرتی کی قصیدہ گوئی مہارت فن کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

دکنی ادب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین دکن پر سب سے زیادہ فروغ مثنوی ہی کو ہوا ہے۔ دکن کے شاعروں میں بمشکل ہی کوئی شاعر ایسا بتایا جا سکتا ہے جس نے مثنوی نہ لکھی ہو۔ مثنوی کی یہ زبردست مقبولیت صاف بتاتی ہے کہ دکن میں علم و شعر کا بہت اچھا مذاق موجود تھا اس لئے کہ غزل کی طرح مثنوی کہہ لینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ اپنی جگہ یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ غزل شاعری کا سب سے زیادہ جوہر دار عنصر ہے۔ اور شاعرانہ نکتہ آفرینیاں غزل ہی کے میدان میں بعید اعجاز حیرت انگیز ہوئی ہیں۔ لیکن مثنوی کہنے کے لئے مسلسل بیان پر جس قدرت کی ضرورت ہے وہ بہتر فنی مہارت چاہتی ہے۔ شمالی ہند نے میر حسن دیا شنکر نسیم اور نواب مرزا شوق جیسے باکمال مثنوی نگار پیدا کئے دکن نے مثنوی کی خدمت جس انداز میں کی ہے وہ حد درجہ قابل ستائش ہے۔ دکن کی مثنویاں صرف عشقیہ نہیں ہیں۔ ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں رزمیہ، پیکار، سیرت و سوانح، اخلاق و

روحانیت کے اعلیٰ مسائل عشقیہ افسانے معاشرت کی تصویریں ملکی زندگی کے نقشے، غرض بڑے متنوع کے ساتھ وہ چیزیں شامل ہیں جس سے زندگی عبارت ہے۔

دکن کے مثنوی نگاروں نے بڑے ہمہ گیر ذوق کے ساتھ فارسی اور ہندوستانی زبان کے اعلیٰ ادبی افسانوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے دکن کی مشہور مثنویوں پر نگاہ ڈالنے سے بآسانی اس کا اندازہ ہو جاتا ہے ملا وجہی کی مثنوی قطب مشتری ایک نیم تاریخی عاشقانہ نظم ہے جس میں سلطان قطب کی روداد محبت کا بیان ہے ملک الشعراء نصرتی کا ادبی شاہکار "علی نامہ" علی عادل شاہ ثانی کی جنگوں اور فتوحات کی دلآویز کہانی ہے۔ مومن کی مثنوی "اسرار عشق" سیرت و سوانح کے باب میں اچھی حیثیت رکھتی ہے۔ قاضی محمود بحری کی "من لگن" کا موضوع تصوف و روحانیت ہے۔ غواصی کے سیف الملوک و بدیع الجمال" ابن نشاطی کی "پھول بن" وجدی کی "پنچھی نامہ" ولی ویلوری کی "رتن و پدم" یہ سب عربی و فارسی اور ہندوستانی ادب کے مشہور افسانوں کا ترجمہ ہیں۔ ان سے اخذ کیے گئے ہیں ادبی حیثیت سے دکن کی اچھی مثنویوں کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان میں اعلیٰ نظم کی پوری شان موجود ہے معنی آفرینی، جذبات نگاری مناظر کی مصوری، کردار کشی یہ سارے یہ سارے حسن ملتے ہیں۔ دکن کی مثنویوں میں ایک اور بات خاص طور پر یہ دیکھی گئی ہے کہ ملکی معاشرت، تمدن، مذہب اور رسم و رواج کی بہت صحیح اور سچی تصویریں انکے صفحات پر مل جاتی ہیں۔ ابن نشاطی کی مشہور مثنوی "پھول بن" کے متعلق ایک ایک فاضل یورپین کی رائے ہے کہ یہ کتاب اس دور کی تاریخ تمدن ہے، یہ چیز تنہا "پھول بن" کا حصہ نہیں ہے۔ دکن کی دوسری مثنویوں میں بھی ملکی زندگی اور معاشرت کی کامیاب مصوری ملتی ہے۔ اس سلسلہ میں تحسین الدین خاں کی مثنوی "کامروپ کلا" بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے سب افراد قصہ ہندو

ہیں اور نظم ہند وطرزِ حیات اور معاشرت کی بڑی ا رنگین تصویر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دکن کی پوری شاعری میں ملکی ماحول گہرے طور پر جا بسا ہے۔ ہندی تشبیہات، استعارات، تمثیلیں، عام ملکی الفاظ، محاورے ہندو دیو مالا غرض دکنی ادب پر ہندی ماحول اور تہذیب کا گہرا اثر ہے اس خاص حیثیت سے دکن کی شاعری بہت حقیقت پسند شاعری ہے اور یہی عوامی شان رکھنے والی شاعری ہے۔ صحیح معنی میں ملکی شاعری ہے اور اس پر وہ اعتراض ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ جو شمالی ہند کے شعر و ادب پر عام طور سے کیا گیا ہے کہ سواد اردو میں شیراز و اصفہان کی رونقیں تو بڑی جگمگاتی ہیں۔ ہندوستانی مناظر کی رنگینی بہت کم نظر آتی ہے یہ حقیقت ہے کہ دکنی ادب نے ملک کی تہذیب و تمدن کو پیشانی کا نور بنا کر پیش کیا ہے۔ اور یہ دکنی ادب کا بہت بڑا امتیاز ہے۔

دکن کی سلطنتیں مذہباً شیعہ تھیں اس لئے دکن میں مرثیہ خوب پھلا پھولا قطب شاہی خاندان کے نامور بادشاہ محمد قلی قطب شاہ نے اچھے مرثیے کہے ہیں۔ بادشاہوں کے مذاق اور ماحول کے تقاضے نے مرثیہ گوئی کو کیفیت فنی دکن کی زمین پر برا ہی وسعت دیا۔ عادل شاہی دور کے ایک مشہور شاعر مرزا تھے۔ جنہوں نے ساری زندگی نعت، منقبت اور مرثیے کے علاوہ کچھ کہا ہی نہیں ان کے علاوہ سیوا شاہی اور دوسرے شاعروں نے مرثیہ گوئی میں اچھا نام پیدا کیا ہے مغلوں کے دورِ حکومت اور اس کے بعد بھی مرثیہ گوئی کو دکن کی زمین پر فروغ رہا۔ اور ولی ویلوری، اشرف، غلامی۔ امامی وغیرہ نے شہرت پائی دکن کے مرثیہ نگاروں نے جذبات نگاری کے بعض عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ سیر توں کے بیان میں بھی کہیں کہیں شاعرانہ حسن نمایاں کیا ہے اور واقعۂ کربلا کے عبرت انگیز پہلو کو خوب خوب اجاگر کیا ہے۔ لیکن دکن میں مرثیہ ادبی حیثیت سے بہت زیادہ

ترقی نہ کر سکا قدرت نے یہ کمال لکھنؤ کے مرثیہ گو شاعروں اور خصوصًا میر انیس کے لئے محفوظ کر دیا تھا۔ کہ وہ مرثیے کو اعلیٰ ترین ادب کے معیار پر پہنچا دیں۔

عالمگیر عہد کے بعد شمالی ہند نے ادب کے میدان میں اس شان و عظمت کے ساتھ ذہن و فکر کی جولانیاں دکھانا شروع کیں کہ اسے مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ دہلی اور لکھنؤ نے ادب کی جو محفلیں قائم کیں ا سو ڈیڑھ سو برس تک پورے ملک میں ان ہی بول بالا رہا۔ اس دور میں دکن خاموشی کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت کرتا رہا غدر کے بعد سے پھر شان و امتیاز کے ساتھ اس نے دنیائے ادب میں نمود حاصل کیا۔

# اردو ادب کا ارتقاء

## شمالی ہند

**ادب کا آغاز** — اردو زبان کی تاریخ ارتقاء پر روشنی ڈالتے ہوئے ہم اوپر یہ بتا چکے ہیں کہ عالمگیر کے عہد تک شمالی ہند میں اردو کی کوئی ادبی حیثیت نہیں قائم ہو سکی تھی۔ البتہ ادب کی آفرینش اور ترقی کے لئے زمین بالکل تیار تھی کچھ شاعروں کے نام مل جاتے ہیں جنہوں نے تفریحی طور پر ریختہ میں جولانی فکر کی۔ فتح کے بعد اردو کی دکنی المطان اور ترقی کی داستانیں کبھی دہلی آئیں پایہ تخت کے ارباب شعر و ادب [illegible] پڑے کہ ان کی زمین پر پیدا ہونے والی اور رنگے بڑے طور پر چلن بنانے والی [illegible] کے ماحول میں یوں پھیلی پھولی اور اتنی پھیلی، ابھری کہ تاج شاہانہ کا طرۂ امتیاز اور اہل فکر و نظر کی سند کمال بن گئی۔ اردو نوازی کا شوق بڑی امنگوں اور حوصلوں کے ساتھ شروع ہوا۔ عالمگیری عہد کے ہزل گو اور پھکڑی شاہ جعفر زٹلی (۱۶۵۹ء تا ۱۷۱۳ء) نے اردو میں بھی شعر کہے اسی دور کے مشہور فارسی شعرا قزلباش خاں امید، سلیمان قلی خاں وداد، معز الدین فطرت، عبدالقادر بیدل اور سعد اللہ گلشن بھی بطور تفریح طبع، اردو میں شعر کہہ لیتے تھے ان کے اشعار تذکروں میں موجود ہیں۔ لیکن ان لوگوں نے کبھی پوری سنجیدگی اور زور فکر کے ساتھ اردو کو وسیلۂ شعر گوئی نہیں بنایا۔

# پہلا صاحب دیوان شاعر

ابھی تک عام خیال یہ تھا کہ ولی کے دیوان کی اشاعت کے بعد (بعہد محمد شاہ) جب دہلی کے گلی کوچوں میں ولی کے اشعار گائے جانے لگے تو اہل فکر نے بہ شان کمال اردو شعر گوئی پر توجہ صرف کی اور شمالی ہند میں صاحب کمال و صاحب دیوان اردو شاعر پیدا ہو گئے لیکن پروفیسر مسعود حسن رضوی نے فائز دہلوی کا دیوان شائع کر کے اس خیال کی تردید کر دی ہے فائز دہلوی ولی کے دور کا شاعر تھا۔ اس کا دیوان ولی کے دوسرے سفر دہلی سے پہلے عہد فرخ سیر (۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء) میں مرتب ہو گیا تھا۔ فائز نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ نظموں کی تعداد غزلوں سے بہت زیادہ ہے فائز کے یہاں بہت سیدھے سادے انداز کی شاعری ہے کہیں کہیں گرمئی سخن بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اہل تحقیق تلاش و دریافت میں مصروف ہیں۔ ممکن ہے آگے چل کر شمالی ہند کے اور شاعروں کا پتہ چلے اور شمالی ہند میں ابتدائی اردو ادب کی تاریخ روشن تر ہو جائے۔

# شمالی ہند کی اردو شاعری

## مزاج، انداز، ارتقاء اور خصوصیات زبان

محمد شاہ رنگیلے (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) کے عہد میں ولی دوبارہ سنہ ۱۷۲۲ء میں دہلی آئے۔ اس بار وہ اپنا دیوان بھی ساتھ لائے تھے۔ محمد شاہ کا دور بڑی

دلچسپیوں رنگ رلیوں اور نشاط وعیش کا دور تھا۔ اکبری و شاہجہانی عظمت کے رنگ عالمگیری کی آنکھ بند ہوتے ہی پڑنے لگے تھے۔ آل تیمور کے ہاتھ سے فتح و اقبال مندی کی تلوار گر چکی تھی۔ پوری سلطنت میں بغاوت و سرکشی کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ فساد و خوں ریزی کے انگارے بھڑک رہے تھے اور زوال و تباہی کی خاک اڑ رہی تھی۔ ۱۷۲۴ء میں نظام الملک آصف جاہ نے عملاً دار السلطنت کے اقتدار کو تسلیم کرنا چھوڑ دیا۔ اور اپنی علیحدہ حکومت قائم کر لی۔ کچھ دنوں بعد بنگال اور پنجاب نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ دہلی پر سب سے پہلے اور سب سے بڑی تباہی نادر شاہ کے ہاتھوں ۱۷۳۹ء میں آئی ۱۷۵۶ء میں احمد شاہ درانی نے چڑھائی کی۔ ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ اور ۱۷۸۹ء میں روہیلا غارت گر غلام قادر پایہ تخت پر چڑھ آیا۔ خون کی ہولی کھیلی تاریخ دہلی کی عبرت انگیز بے بسی کا یہ عالم کہ سرکش روہیلے نے بادشاہ وقت شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا ڈالیں۔ تاج دہلی سیاسی بازی گروں کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن گیا تھا۔ مٹی ہوئی عظمت کی حسرت بھری نشانی، طاقت و اقتدار سے محروم روز بروز اس کی ضو پھیکی پڑتی گئی۔ اس کی اقبال مندی دوسروں کے عروج کی رونق بنتی گئی۔ یہاں تک کہ غدر ۱۸۵۷ء نے اسے خاک عدم کی نذر کر دیا۔ اس سے بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ دہلی میں اردو ادب کی محفل اس وقت قائم ہوئی جب زوال اور تباہی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ محفل رنگ پر آنے کو ہوتی کہ کوئی نہ کوئی آسمانی بلا نازل ہو جاتی اور محفل درہم برہم ہونے لگتی یہ اسباب تھے جن کے باعث بڑے بڑے اہل کمال دہلی چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ خان آرزو، سودا، میر حسن، انشا، مصحفی، جرات، اور نہ جانے کتنے شاعر دہلی چھوڑ کر ملک کے دوسرے حصوں میں بالخصوص پایہ تخت اودھ لکھنؤ میں جا بسے شعر و ادب کے ایک نئے دبستان لکھنؤ کو فروغ ہوا۔ اور شاہ اودھ کی جدت

طرازیوں نے ادب میں اپنے کمال کے خاص امتیاز پیدا کر دیے۔

زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ زبان اور اس کے شعر و ادب میں بھی نئے رنگ ابھرتے رہتے ہیں۔ تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ نئے مذاق کے مطابق نئی اصلاحیں ہوتی ہیں۔ نئی ترقیاں اس کے قدم آگے بڑھاتی ہیں۔ اور نئی کیفیتیں فکر و نظر کے نئے معیار قائم کرتی ہیں۔ زمانے کے ہاتھوں نے جب اردو کے مرکز کو دکن سے دہلی میں منتقل کیا۔ تو زبان و ادب میں اردو کی ترقی اس طرح ہوئی کہ دکن والوں نے شمالی ہند سے اپنی سیاسی آزادی اور خود مختاری کو امتیازی شان کے ساتھ قائم کرنے کے لیے ملکی تمدنی اور ملکی زبان کو عروج و افتخار عطا کیا۔ اس پر شاہانہ نوازشیں ہوئی۔ اور اس کا ادب دکن والوں کا سرمایہ امتیاز بنا۔ اسی لیے دکنی اردو پر فارسی کا غلبہ نہیں ہونے پایا۔ ہندی کے الفاظ ترکیبیں محاورے کہاوتیں استعارے اور ملکی دیومالا ادب کا زیور بن کر رہے۔ اردو ادب ملکی تمدن کے رنگ میں ڈوبا اور رچا بسا رہا۔ اس نے ایک آزاد اور خود مختار حیثیت رکھی۔ شمالی ہند کا رنگ دوسرا تھا۔ یہاں تہذیب و تمدن کی شان بالکل مختلف تھی۔ یہاں فارسی کی اقبال مندی خسروانہ حشمت کی مالک تھی۔ درباروں میں اس کے جھنڈے گڑے تھے۔ شائستگی کی محفلوں میں اس کا بول بالا شعر و ادب و انشا اس کے جلو میں چلتے تھے۔ اس کا ادب ذہنی شائستگی کے معیار قائم کرتا تھا۔ اس کے دربار سے تہذیب و عظمت کی سندیں تقسیم ہوتی تھیں۔ اس کی دنیا کنار گنگ و جمن کی لطافتوں کی دنیا نہیں تھی۔ اس کی محفلوں میں لحن داؤدی تھا۔ کرشن بنسری کی الاپ نہیں تھی۔ شیراز و اصفہان کی طرب انگیزیاں تھیں۔ دوآب کے شاداب میدانوں، جنت نظیر کشمیر کے مرغزاروں اور حسن خیز زمین مالوہ کو مستیوں کا رنگ میسر آ دینے والی رونقیں نہیں تھیں۔ یہاں لیلیٰ عراق کا نمکین سانولا پن اور شیریں عجم کی صباحت گرمئی محبت کا جادو جگاتی

رہیں۔ سورج کو شرما دینے والی پدمنی کے ماتھے کی جوت کبھی تمنائے نظر نہ بن سکی۔ معنی آفرینی، بلاغت مضمون اور زبان و بیان کے اعجاز کے اعتبار سے ہندوستان کا فارسی ادب بہت بلند پایہ بہت گرانمایہ ہے۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اس میں وہ حقیقت پسندی نہیں ہے جو زندگی اور ماحول کے رابطے اور تعلق سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی فضا ایرانی ہے ہندی نہیں ہے۔ اور اس کے تخیل میں گرمی اور نشتریت بھی خالص ایرانی مذاق کی دین ہے۔ اردو ادب نے دلی کی زمین پر قدم رکھا تو اس کی دنیا میں ایک انقلاب آ گیا۔ اصلاح کا ایک زبردست عمل شروع ہوا جو قریب سوا سو برس جاری رہا۔ خیال و فکر کی دنیا میں نئے رنگوں کی بہار آئی زبان کی صورت، چہرے، ظاہر بیرونی نظام ساخت و ترکیب میں فرق آیا۔ اور ترقی و اصلاح کے عمل نے اردو زبان و ادب کی وہ حیثیت قائم کر دی جو غالب، مومن، ذوق، آتش و ناسخ یہاں اپنے نقطۂ کمال کو پہنچ گئی۔ شمالی ہند نے زبان میں جو اصلاحیں کیں اور ادب کا معیار قائم کیا اس کے بہت سے پہلو ہیں۔ تفصیلی اظہار خیال کی اجمالی مطالعے میں گنجائش ہے لیکن ہم بات کو زیادہ پھیلائے بغیر سمیٹ کر بھی خاص اور امتیازی چیزوں کو نمایاں کر سکتے ہیں۔

زبان و ادب میں اصلاح و ترقی کا ایک عمل وہ ہے جو بالکل فطری ہوتا ہے اور زمانے کے ساتھ ساتھ ابھرنے والے تمدنی تقاضوں کے تحت ہوتا رہتا ہے۔ اور الفاظ کا روپ بدلتا ہے۔ تراش خراش ان میں نئے انداز سے سلونے پن اور اثر پذیری اور معنویت کے جادو کو ابھارتی ہے، وقت کے ساتھ بہت سے الفاظ نامانوس قرار پاتے ہیں۔ بہت سے محاورے، ترکیبیں اور ادبی صنعت و آرائش کے زیور اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتے ہیں۔ اور زبان و ادب کے دائرے سے ان کا اخراج ہو جاتا ہے۔ بڑھتا ہوا علم، مشاہدہ اور تمدنی ترقیاں نئے

الفاظ نئی ترکیبیں اور زیب و آرائش کے نئے سامانوں سے زبان و ادب کو مزین کرتی رہتی ہیں۔

دہلی ۔ لکھنؤ اور شمالی ہند نے اردو زبان و ادب میں جو اصلاحیں کیں اور جس انداز سے اس کا مزاج بنایا وہ بنیادی اہمیت اس لئے رکھتا ہے کہ اس نے بڑی حد تک اردو کے مستقبل کی راہ بنادی آج زبان و ادب جس منزل سے گزر رہے ہیں اس کے پیش نظر یہ بہت ضروری ہے کہ ہم بہت صاحب نظر اور صاف ذہن کے ساتھ بالکل بے لوث انداز میں اصلاح و ترقی کے اس عمل کا جائزہ لیں زبان و ادب پر نگاہ ڈالنے سے تغیر اور تبدیلی کی چند حیثیتیں بالکل نمایاں ہو جاتی ہیں۔

(۱) دکنی اردو کے وہ الفاظ محاورے، ترکیبیں اور بیان انداز خالص مقامی حیثیت رکھتے تھے اور جن کا سمجھنا صرف اہل دکن کے لئے ممکن تھا شمالی ہند میں آکر ادبی زندگی سے محروم ہو گئے۔

(۲) بہت سے الفاظ جو دکنی ادب میں استعمال ہوتے تھے صوتی لطافت کے معیار پر بھدے کھردرے اور بے ڈھنگے سے تھے۔ ان کے زیادہ سبک سلونے اور سڈول روپ قائم ہوئے۔

(۳) دہلی پایہ تخت سلطنت ہونے کے سبب ہندوستان کا بین الصوبجاتی مرکز تھا۔ اور زمین ہند پر تہذیب و تمدن کا سب سے بڑا گہوارہ تھا۔ اکی سماجی زندگی میں بڑے وسیع پیمانے پر تہذیبی میل جول اور تمدنی لین دین کا بازار گرم رہتا تھا۔ اس کی زبان میں زیادہ گہرائی، اثر پذیری کی شان اور ترقیوں کی نمود تھی۔ شمالی ہند میں جب اردو نے ادبی و تصنیفی حیثیت سے اختیار کی تو اس بڑھتی پھیلتی اور زمانے کے قدم بہ قدم چلتی ہوئی زبان کے سارے خزانے ادب کے تصرف میں آگئے۔ اور اس

طرح اس کے دائرے میں بڑی وسعتیں پیدا ہو گئیں۔

(۴) شمالی ہند نے فارسی شعر و ادب کے جواہر ریزوں کی ضو سے اردو کے تخیل، کلام، بیان، اور زبان کو جلا دی اردو زندہ طاقتور اور صدیوں مہذب دنیا پر خسروانہ اقتدار رکھنے والے فارسی شعر و ادب سے زیادہ قریبی رابطے میں آئی اس کے الفاظ میں شاندار اضافہ ہوا۔ سینکڑوں نئی تشبیہیں استعارے، تمثیلیں، رنگین بیانی کے نئے انداز، آرائش و زیبائش فن کے نئے زیور اردو کو مل گئے۔ جنہوں نے اسے لطافت اور زور بیان، شکوہ تخیل اور تابشی فکر و نظر عطا کی۔ فردوسی، [illegible]، سنائی، رومی، حافظ، خیام، قاآنی عربی کی زبان لطافت فکر و خیال، معانی دقیق اور عرفان و روحانیت کا گنجینہ ہے اس کے ساتھ بلند نگاہی اور فراخ مشربی کی بڑی روشن روایت [illegible]۔ فارسی کے اثر نے اردو کو وہ عالمگیری اور انسانی نگاہی جو مرد فکر و عرفان اقبال کے قالب سخن میں یوں زمزمہ پیرا ہو گئی ہے

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی، نہ صفاہاں نہ سمرقند

(۵) شمالی ہند نے زبان کی ساخت و ترکیب کے اصولوں کی تدوین کی اس کی قواعد مرتب کی۔ اس کی لغت تیار کی اس کی شائستگی اور شستگی کا ادبی معیار مقرر کیا اور اس کے ادیبوں اور شاعروں نے برسوں کی ریاضی و محنت سے اس ادبی معیار کو بازار زندگی کا کھرا سکہ بنا دیا۔

ابھی تک ہم نے تغیر اور تبدیلی کے جن پہلوؤں پر نگاہ ڈالی ہے وہ شمالی ہند کی بڑی شاندار خدمات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بخصوص مقامی مقبولیت رکھنے والے الفاظ کو خارج کر دینا۔ رائج الفاظ میں صوتی تغیر سے رچاؤ اور سیلاپن پیدا کر لینا نئے الفاظ، محاورے، ترکیبیں وغیرہ لے لینا، فارسی شعر و ادب سے

دل کھول کر استفادہ کرنا زبان کو اصولی اور باقاعدہ حیثیت دینا ان میں کوئی چیز قطعاً قابل اعتراض نہیں ہے البتہ اس کاٹ چھانٹ میں ہندی کے سبک، شیریں نرم اور موثر الفاظ کو خارج کر دینا فارسی کے زیر اثر اسی حد تک آجانا کہ فارسی شعر و ادب کے مغز و فکر اور رمز لطافت و بلاغت سے گزر کر اس کے خارجی لوازم کو جلد بدن بنا لیا اس کے معیار کو اپنا معیار اس کی پسند کو اپنی پسند، اس نگاہ کو اپنی نگاہ، اس کے روپ رنگ کو اپنا روپ رنگ سمجھ بیٹھنا یہ اردو زبان کی فطرت پر ظلم تھا۔ اس کو اپنے اصلی مرکز سے ہٹانا تھا۔ اسے خیالی اور تصنع پسند بنانا تھا۔ ہندوستان کے زمین و آسمان اس کے دریا اور پہاڑ اس کے پپیہے کی جانستان "پی کہاں" اس کی لطافت شام و سحر اور اس کی فضا میں رقص کرنے والی رعنائیاں انھوں نے ہمیں ذوق اور خاص نظر بخشا ہے۔ اس کے دامن میں حسن کا ایک واضح مفہوم ہے اور روح کو جگانے والا جادو ہے۔ اردو اپنی فطرت میں ایک دورخی زبان ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دوستی و محبت کی یادگار ہے۔ ہندی اور ایرانی تہذیبوں کے میل جول کی نشانی ہے۔ چاہیے تھا کہ جیسے اس کی بنیاد میں ہندی فطرت سموئی ہوئی ہے۔ اسی طرح خیال کی اعلیٰ ترین بلندیوں تک فن کے لوازم میں، زیبائش و آرائش کے سامان میں، روپ رنگ میں، نکھار میں، فکر لطیف کی پرواز میں، خیالات کے تار و پود میں برج بنسری بڑی مدھر تان دیتی تب ہمہ گیر انداز میں سچے طور پر ہمارا ادب ہر رخ اور ہر پہلو سے ہند ایرانی بہار تہذیب کا آئینہ بن جاتا۔ اگر شمالی ہند کے شاعر اردو کی اس دورخی فطرت کا احساس رکھتے اور فارسی کو اعلیٰ حسن امتزاج کے ساتھ ایک قالب میں سمو کر اردو ادب کی صورت

گرے کرتے تو یقیناً اردو ایشیا کی سب سے زیادہ جاندار سب سے زیادہ تو انا سب سے زیادہ رسیلی بن جاتی۔ اس خمیر میں یہ جوہر موجود ہے۔

دکنی ادب نے اسی جوہر کو چمکایا۔ دکنی زبان اور ادب پہ صحیح ترقی کا عمل یہ تھا کہ اس جوہر کو اور زیادہ بلند نگاہی اور وسعت ظرف کے ساتھ چمکایا جاتا۔

شمالی ہند نے زبان و ادب میں جو اصلاحات کیں ہم نے ان کی خصوصیات پہ اختصار کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ اصلاح کا یہ عمل اسی دن شروع ہو گیا تھا۔ جب ولیؔ دکنی اورنگ آبادی کے ورود دہلی کے ساتھ پایۂ تخت میں اہل کمال پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ اردو شعر گوئی کی طرف مائل ہونے لگے۔ اور دہلی میں اردو شاعری کی محفل قائم ہو گئی۔ لکھنؤ کے نامور استاد اور لکھنؤ دبستان شعر و ادب کے بانی شیخ امام بخش ناسخ اور ان کے تلامذہ نے اس عمل اصلاح کو اپنے دائرے میں حدِ کمال تک پہونچا دیا۔

شمالی ہند میں دورِ اوّل کے ممتاز شاعر خان آرزو، شاہ مبارک آبرو، محمد شاکر ناجی، شاہ ظہور الدین حاتم اور مرزا مظہر جانِ جاناں تھے۔ ان شاعروں کے یہاں بہت حد تک شاعری کا فطری اور اصلی رنگ ہے۔ تخییل شعر میں ایک دلکش سادگی ہے۔ زبان میں فارسی الفاظ، ترکیبوں اور آرائشی لوازم کا بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ شاہ حاتم نے خاص طور پر واضح مقصد کے ساتھ اصلاح زبان کی طرف توجہ کی۔ اس دور میں صنعت ایہام کا کثرت سے رواج تھا۔ مرزا مظہر جانِ جاناں نے شاعری کو ایہام گوئی کے عیب سے پاک کیا۔ اور زبان و کلام میں صفائی و شستگی، پاکیزگی اور کیفیت پیدا کی۔

دوسرے دور کے ممتاز شاعر سوداؔ۔ میرؔ۔ خواجہ میر دردؔ۔ میر سوزؔ

اور میر حسن ہیں۔ اس دورِ شعر و سخن کو اردو شاعری کا "عہدِ زریں" کہا گیا۔ اس دور میں اردو شاعری کا دامن بہت وسیع ہو گیا۔ الفاظ میں زبردست اضافہ ہوا بیان میں اعلیٰ معیار کی رنگینیاں نمودار ہوئیں۔ پرواز فکر نے معانی آفرینی اور شکوہِ تخئیل کے حیرت انگیز جلوے دکھائے سودا نے قصیدہ گوئی کو آسمان پر پہنچا دیا۔ میر نے اردو غزل کو جاوداں کیف واثر دیا۔ حسن کی مثنوی آج بھی اعجازِ بیان کی داد لے رہی ہے اس دور میں اردو کے دامن پر فارسی کے تحلیل اور زبان کی آرائشیں زیادہ گہرائی کے ساتھ نمایاں ہوئیں۔ اصلاحِ زبان کا عمل تیزی سے قدم بڑھانے لگا۔ اور فارسی طرز پر اردو شعر گوئی کی بنیادیں مضبوط ہو گئیں۔

تیسرا دور مصحفی، انشاء اور جرأت کا دور ہے۔ دہلی کے آئے دن کی تباہیوں سے پریشان ہو کر شاعر اور کمالان فن ملک کے مختلف حصوں میں ہجرت کرتے جا رہے تھے۔ دہلی چھوڑنے والوں کے لئے سب سے زیادہ کشش خاک اودھ میں تھی کیونکہ فیض آباد اور لکھنؤ میں امن و امان تھا۔ فیاض دربار تھا۔ عیش و طرب کی فراوانی تھی۔ علم و کمال کی قدردانی تھی اور فنون لطیفہ کے لئے جنت کامرانی، خان آرزو۔ سودا، میر حسن، میر سوز دہلی سے فیض آباد اور لکھنؤ آئے۔ ان کے یہاں دہلی کے طرز سخن گوئی کی روایتیں باقی رہیں۔ مصحفی اور انشاء کے ساتھ درباری شاعری، شاعری کا ایک خاص رنگ ابھرا عیش پسندی نے انتراع ذہن کو سطحیت کی طرف مائل کر دیا۔ شاعری کی حقیقی روح کمزور پڑ گئی۔ لفظ و بیان کی آرائشوں پر زیادہ توجہ ہونے لگی۔ نغموں میں دل کو گرمانے والی کیفیت پھیکی پڑ گئی۔ جو اس کو بھڑکا دینے والی آگ تیز تر ہونے لگی۔

نیں خوب بنا، سنورا نکھرا اسی دور میں زبان کی باقاعدہ کوشش شروع ہوئی فارسیت کا غلبہ نمایاں سے نمایاں تر ہو گیا۔ فن خوب چمکا شعریت پھلی پھولی مگر یہ ہے لکھنوی ماحول کا اثر، لکھنوی فکر کی سطحیت اور ہوس پرستی کا سب سے عریاں مظہر فن ریختی ہے جسے سعادت یار خاں رنگین اور انشاء کے ہاتھوں شمالی ہند میں تو جیون ملا اور جان صاحب نے جس کی بدولت خاص شہرت حاصل کر لی۔ طبیعت کے منچلے پن نے جدت کی یہ راہ دکھائی کہ مرد کو عورت کی زبان، لہجہ، طرز کلام، وہ نخرے غمزے ادائیں دے کر ریختی کے میدان میں مایۂ تفریح بنا دیا۔

نظیر اکبر آبادی کا رنگ سخن اس قدر ممتاز، اس کی انفرادیت اس قدر شاندار اور زبان و ادب کی تاریخ میں اس کی شاعرانہ حیثیت اس قدر منفرد ہے کہ اس کی ذات مستقل دبستان کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظیر نے لمبی عمر پائی دور میر بھی دیکھا اور زمانۂ ناسخ بھی۔ دہلی اور لکھنؤ کے مرکزوں سے الگ اپنے رنگ میں مست مگن شعری سنگیت کے اس منوہر پیا نے برج دیش کی سندری بھومی پر من کے گیت چھیڑے۔ برہا راگ پیا ملن کا سندیسہ مایا میں ڈوبے ہوؤں کو من سنسار کی منوہر بانی۔ کنار جمنا کے رنگین مناظر ہندو مسلمانوں کے تہوار، میلے، ٹھیلے، شادی، غمی، کی مجلس نظیر کے کلام میں ہندوستانی عوام کی پوری زندگی بڑی بہار دکھاتی ہے۔ نظیر شاعر ہندی ہے۔ اور اپنی دنیا میں اس قدر بلند ہے کہ کوئی اس کی گرد پا کو بھی نہیں پہونچتا۔

چوتھا دور یہ وہ زمانہ ہے جب اردو شعر گوئی کے دو اسکول دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ قائم ہو گئے۔ لکھنؤ میں ناسخ و آتش کی استادی کا سکہ چلا۔ تاریخ

نے اصلاح زبان کے اس عمل کو مکمل کر دیا جس کا آغاز شاہ حاتم نے کیا تھا۔ بھا
شا کے الفاظ کا کامل اخراج ہو گیا شعر گوئی پر فن کے سخت پہرے بٹھائے
خواص اور عوام کی زبان کے فرق کو خوب اجاگر کیا گیا۔ خواص کے معیار پر صحت،
الفاظ، تراکیب کی شائستگی وغیرہ کے اونچے معیار قائم ہوئے اس ذوق اصلاح
اور ہمہ گیر تراش خراش سے جو نقصانات اردو شاعری کو ہوئے ان سے قطع نظر،
ناسخ کی زباندانی قدرت فن اور مشاقی طبیعت بالکل مسلم ہے۔ ناسخ اسکول
...علی اوسط رشک اور اس کے بعد ضامن علی جلال نے تدوین زبان کے
سلسلے میں بڑے نمایاں کام کئے۔ ناسخ کے یہاں فن ہی فن ہے۔ شعریت واجبی
...م کی ہے۔ البتہ آتش کی غزل گوئی کا معیار بہت بلند ہے اس کے یہاں
روحانیت کی چاشنی ہے تخیل کی لطافت ہے جذبے کی تراکیب کا مطالعہ
ہے۔ محبت کا درد، لذت اور رنگینیاں ہیں۔ ان استادوں کے شاگردوں
...رند، صبا، خلیل، ہجر، قلق، وزیر، اشک، دیا شنکر نسیم۔ آباد وغیرہ
بڑی شہرت ہوئی، دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم"، قوت نظر، زور تخیل اور
قدرت بیان کا بہت اعلیٰ نمونہ ہے۔ نواب مرزا شوق کی تصنیف "زہر عشق"
...ادب کا وہ اعجاز ہے۔ جس پر اردو ہمیشہ ناز کرتی رہے گی۔ عام طور پر لکھنو
...شاعری میں "سخن دل" نہیں "آتش سخن" ہے ظاہری چمک دمک ہے طبیعت
...رنگ داری اور بانکپن کی نمائش ہے یہ چیزیں شاعر کے اعلیٰ معیار سے بہت
...گرا دیں۔

لیکن لکھنؤ کے مرثیہ گوئی کو اس انداز سے زیادہ عروج و فروغ بخشا کہ
اردو کو ایک بیش بہا خزانہ مل گیا۔ اردو شاعری میں روز اول سے مرثیہ نگاری
مقبول رہی۔ لکھنؤ میں پہلے خلیق و ضمیر نے اس رنگ کو چمکایا۔ لیکن یہ صنف نظم

دبیر و انیس کے یہاں معراجِ کمال کو پہنچ گئی۔ مرثیہ نے شاعری کے دائرے کو بہت وسیع کر دیا اور اس کے دامن کو ہزار رنگ کے موتیوں سے بھر دیا۔ اردو کی پرانی شاعری میں واردات حسن و عشق اور تصوف و اخلاق کے مسائل کے سوا کچھ ہی کیا۔ لکھنؤ کے مرثیہ نگاروں نے واقعات کربلا کو اس طرح پیش کیا کہ گھریلو زندگی کے دلفروز مناظر، سفر کے مصائب، لڑائی کے اہتمام جیسے اور ہنگامے عورتوں کے جذبات کی دنیا، بچوں کے نفسیات، شباب حیات پسند کے حوصلے امنگیں اور خون زندگی سے انسانی عظمت کردار کی تاریخ لکھنے کی تمنائیں زر اور زمین کے پجاریوں کی نفس پرستی کے بھیانک روپ، برائیوں کے درمیان انسانیت کے معصوم روشن جلوے مختصر یہ کہ رزمیہ جذبات نگاری، مناظر قدرت کی عکاسی، پیکر آفرینی، کردار کشی۔ اخلاقی پند و موعظت، غرض شاعری کی ایک دنیا سما گئی۔ اردو کا سب سے بڑا مرثیہ نگار شاعر انیس عالمی ادب کے چیدہ جلیل ارباب فن و کمال میں باوقار حیثیت رکھتا ہے۔

شاعری کے مزاج کے خلاف اہل دہلی نے دل کی بات دلی والوں کی زبان میں کہی فکر کے معیار کو بلند رکھا حسن کو جام بلوریں کے نقش و نگار میں نہیں موج شراب میں دیکھا۔ فکر غالب نے اردو شاعری کو آفاقی عظمت عطا کر دی مومن کے تغزل میں اہل نظر کو حلاوت معنی اور سرمستی و سرشاری جذبہ کی جنت مل گئی ذوق نے شوکت بیان اور اعلیٰ قوت نظم کے معرکہ آرا منظر دکھائے زبان کی بڑی لطافت سے نکھارا، سنوارا اور رشتہ و رفتہ کیا۔ ذوق کی تربیت نے زبان و بیان کا وہ زبردست ساحر پیدا کیا جس کے نغمے پورے ہندوستان پر چھا گئے۔

دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے فرق اور اختلافات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے دہلی اور لکھنؤ والوں میں کچھ تو زبان کے اختلافات ہیں لیکن ان کی کوئی بڑی اہمیت

نہیں اصل فرق تو رنگ سخن کا ہے اردو شاعری کے دورِ عروج میں دہلی اپنی عظمت ماضی کا عبرت انگیز مرثیہ پڑھ رہی تھی، اس کی فضا میں درد و غم تھا۔ عبرت تھی، فنا کے آثار تھے۔ اس کا ماحول دل کی گہرائیوں میں پرورش پانے والے جذبات کو ابھارنے کے لئے زیادہ سازگار تھا۔ اس کی شاعری میں جذبہ کی صداقت زیادہ ملتی ہے لکھنؤ میں بظاہر پورا امن و امان تھا۔ عیش وافر کے سامان تھے دولت کی ریل پیل تھی، "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کا ماحول سامنے تھا۔ کوئی حیات آزما مقصد سامنے تھا۔ انہیں طبیعت کی امنگوں نے ظاہری نفاست اور خارجی آرائش زندگی میں خوب خوب جدت طرازیاں کیں دربار کے اثر اور عیش پسندی کے ماحول نے فکر میں سطحیت پیدا کر دی جلوۂ دوست کو عریاں کر دیا نگاہوں کو مغز فن سے زیادہ لوازم فن کا پرستار بنا دیا۔ فضا کچھ سازگار تھی منچلے شعر و ادب میں ہوا و ہوس کا خوب خوب پھاگ کھیلنے لگے لکھنؤ بدنام ہوگیا، رسوائیاں اس کے دامن سے لپٹ کر رہ گئیں۔ زبان کے معاملہ میں ناسخ کی سخت گیری ریختی کے مکروہ اثرات بنام محبت ذوق ہوس رانی کی ہانکے پکارے لذت طلبی انکی بنا پر لکھنؤ کی زبردست خدمات ادب سے انکار ممکن نہیں ہے آتش کی غزل گوئی انیس کی مرثیہ نگاری تخیل نسیم کی نزاکت آفرینیاں اور صاحب "زہر عشق" کا اعجاز نگارش باغ سخن کے یہ صد بہار پھول زمین لکھنؤ پر کھلے اور خزانہ ادب کے انمول موتیوں کی نمائش لکھنؤ کے نگارخانہ شعر و ادب میں ہوئی دہلی میں شاہ نصیر بھی تھے جن کے یہاں فن تو خوب ہے۔ لیکن شعریت ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں زمانے کے ہاتھوں تیزی سے تباہ ہوتی ہوئی دہلی اور اردو شعر گوئی کی محفل قائم ہوئی۔ نواب شجاع الدولہ والی اودھ کی فیاضیوں نے فیض آباد کو دوسرا مرکز ادب بنا دیا۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں اودھ

کا پایہ تخت لکھنؤ بنا اور اردو کی محفل شعر و ادب لکھنؤ منتقل ہو آئی دہلی کے بادشاہ کبھی جیسی کچھ ممکن تھی شعر و ادب کی سرپرستی کرتے رہے اور والیان لکھنؤ کی فیا ضیاں تو آواز عام بن کر سارے ملک میں پھیل گئیں مغل سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر اور آخری والی اودھ واجد علی شاہ اختر دونوں شعر و ادب کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ اور اچھی حیثیت کے شاعر تھے۔ ۱۸۵۶ء میں اودھ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ اور ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب نے مغلوں کی حکومت ختم کر دی۔ تلاش معاش میں شاعر دہلی اور لکھنؤ سے نکل کھڑے ہوئے اور رئیسی ریاستوں کے درباروں سے وابستہ ہو گئے۔ شعر و ادب کی دنیا میں نئے انداز کی طرحیں ڈالی گئیں۔ اور ذوق خوشنوائی نے نئے مقاموں میں رونمائی کی شعر و ادب کی پرانی روایتوں کو داغ، نسیم دہلوی، ظہیر دہلوی، امیر اللہ تسلیم، مجروح، ممنون، امیر مینائی اور جلال لکھنؤ نے بڑی قدرت فن کے ساتھ زندہ رکھا ان میں داغ امیر اور جلال کو خاص شہرت حاصل ہوئی انہوں نے زبان کو اور صاف و شستہ کیا۔ لیکن ان میں کوئی غالب، مومن اور آتش نہ بن سکا۔

اوپر کی سطروں میں ہم نے آمد ولی کے وقت سے امیر و داغ کے زمانے تک شمالی ہند میں اردو شاعری کے مزاج ارتقا، اور عہد بعہد کی ترقیوں اور خصوصیات پر نگاہ ڈالی ہے۔ ذیل میں ہم اس زمانے کے بہت خاص امتیاز رکھنے والے شاعروں کا مختصر حال بیان کریں گے۔ اور ان کے کلام کی خصوصیات پر بھی روشنی ڈالیں گے۔ تاکہ شمالی ہند کے شعر و ادب کا مزاج انداز خصوصیات اچھی طرح نمایاں ہو جائیں۔

# معاصرین ولی کا دور

## خان آرزو سنہ ۱۶۸۹ء تا ۱۷۵۶ء

معاصرین ولی میں خان آرزو کی حیثیت سب سے زیادہ ممتاز ہے۔ دہلی کے ادبی حلقوں میں وہ شمع انجمن تھے۔ بڑے صاحب نظر ناقد، محقق اور زبان داں تھے شعر گوئی میں استادانہ مرتبہ رکھتے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے اُن کی علمیت اعلیٰ اخلاق اور وقار و مرتبہ کا ذکر بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ ان کی ذات سے اردو شعر گوئی کو دہلی میں بڑا فروغ حاصل ہوا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ ان کی زبان کو اردو کے ساتھ وہی مناسبت ہے جو ارسطو کو فلسفہ کے ساتھ، شاہ محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں سے تھے۔ بچپن سے علم و ادب اور شعر گوئی کا بہت پاکیزہ اور بلند مذاق رکھتے تھے۔ حملۂ نادری کے بعد دہلی سے لکھنؤ آئے جہاں ۱۷۵۶ء میں انتقال کیا۔

خان آرزو کی تصانیف بہ کثرت ہیں۔ فارسی میں بیس ہزار اشعار کا ضخیم دیوان موجود ہے۔ اردو شعر کم کہے ہیں۔ لیکن ان کی استادانہ حیثیت اس لئے مسلم ہے۔ کہ وہ میر تقی میر جیسے زبردست شاعر اور دوسرے بہت سے شعرا کے سرپرست تھے۔ میر، سودا۔ درد۔ مظہر اس دور کے تمام شاعروں نے اُنھیں استاد عصر مانا ہے۔ اُن کے چند اشعار درج ذیل ہیں

آتا ہے ہر سحر اُٹھ تیری برابری کو — کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو

رکھے سی پارۂ دل کھول آئے عندلیبوں کے　　چمن میں آج گویا پھول ہیں تیرے شہیدوں کے
اس زلفِ سیاہ فام کی کیا دھوم پڑی ہے　　آئینہ کے گلشن میں گھٹا جھوم پڑی ہے

**شاہ مبارک آبرو** — ۱۶۹۲ء تا ۱۷۳۳ء۔ نجم الدین نام، آبرو تخلص اور شاہ مبارک لقب تھا۔ دورِ اول کے ممتاز شاعروں میں تھے۔ خان آرزو کے رشتہ دار تھے۔ اور کہنہ مشقی کے باوجود ہمیشہ اُنھیں اپنا کلام دکھاتے رہے۔ آبرو شاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ بقول مصنف "گل رعنا" طبیعت رسا اور فکر معنی یاب تھی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق تشبیہ اور ایہام میں کلام اُلجھا ہوا ہے۔ محاوروں کی چاشنی نے اُسے بامزہ کردیا ہے۔" اشعار نمونہ یہ ہیں۔

نکلے تو آ صبا کی طرح جب چمن میں پھول　　گلشن کو دیکھ تجھکو گئے ہاتھ پاؤں پھول
کریں جو بندگی ہو ویں گنہ گار　　بتوں کی کچھ نرالی ہے خدائی
پھرتے تھے دشت دشت دیوانے کدھر گئے　　وہ ہائے عاشقی کے زمانے کدھر گئے
دل تو دیکھو آدم بے باک کا　　عشق سے پتلا بھرا ہے خاک کا

**شیخ شرف الدین مضمون** — متوفی ۱۷۳۴ء۔ شیخ شرف الدین نام۔ مضمون تخلص تھا۔ قصبہ جاجمئو صوبہ اکبرآباد کے رہنے والے تھے۔ ابتدائے شباب دلی میں گذرے۔ زینت المساجد میں قیام کیا۔ ایسے پیر توڑ کر بیٹھے ساری عمر اسی مسجد میں گذار دی۔ خان آرزو کے شاگرد تھے۔ آرزو اُنھیں شاعر بے دانہ کہتے تھے۔ اس لیے کہ اُن کے دانت گر گئے تھے۔ بڑے خوش مزاج تھے۔ اور ادبی محفلوں کی رونق تھے۔ میر تقی میر کے الفاظ میں، "ہر چند گم گو بود۔ لیکن بسیار خوش فکر" ان کے کلام میں کافی دلکشی ہے۔

ابہام اور مراعاۃ النظیر کا اُن کے یہاں بھی زور ہے۔ دو سو اشعار کا دیوان چھوڑا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا
صبر ایوب کیا، گریہ یعقوب کیا

کرے ہے دار بھی کامل کو معراج
ہوا منصور سے یہ نکتہ حاصل آج

افسوس یار جھٹ پٹ لیتے ہیں دل کو اٹکا
کن ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیرے لٹکا

**محمد شاکر ناجی** :- متوفی ۱۱۵۷ھ ۱۷۴۴ء۔ ناجی اس دور کے بڑے زندہ دل شاعر تھے۔ نواب امیر خاں کے دیوان خانے کے داروغہ تھے۔ نہایت تیز مزاج، شوخ طبع اور ظریف تھے۔ جس سے اُلجھ پڑتے اس کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔ ایک طولانی مخمس میں حملہ نادری کی تباہیوں کا چشم دید حال لکھا ہے میر تقی میر کے بقول کلام میں ہزل بہت تھا۔ اپنے مذاق آمیز کلام سے لوگوں کو ہنسانے اور خود مضحکہ بناتے۔ زبان کی سادگی اور خیالات کی دل کشی نے کلام کو مقبولیت بخشی۔ اس دور کے عام رنگ کے مطابق اس کے یہاں بھی ایہام اور استعارات کی کثرت ہے۔ اُن کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

نہ سیر باغ نہ ملنا نہ میٹھی باتیں ہیں
یہ دن بہار کے اے جان مفت جاتے ہیں

آج تو ناجی سجن سے کرلے اپنا عرضِ حال
مرنے جینے کا نہ کر وسواس ہونی ہو سو ہو

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم
لب صدف کے تر نہیں ہرچند ہے گوہر میں آب

نہ پوچھو خود بخود ہے عارضِ خورشید کی خوبی
لیا ہے ذرہ ذرہ حسنِ مہرویاں نے کر چندہ

**مصطفےٰ خاں یک رنگ** :- یک رنگ بھی شاہی امرا میں سے تھے۔ ان کا شمار بھی اسی دور کے باکمال فن میں کیا گیا ہے۔ کلام بلند ہے۔ استعارات

کی کثرت ہے۔ غزلیں عاشقانہ اور عارفانہ دونوں رنگ کی ہیں۔ شہید کربلا کی شان میں ایک مرثیہ بھی کہا ہے۔ مرزا جان جاناں مظہر کے شاگرد تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے

سُنتا نہیں ہے بات کسی کی نوائے سخن — تجکو نزا غرور نہ جانے کر لگا کیا
نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے — ہمرا صبر و قرار جاتا ہے
کہتے ہم ہیں پکار سنو کان دھر سجن — کہ غیر سے ملوگے تو دیکھوگے ہم نہیں

**محمد حسین کلیم** — تذکرہ نگاروں نے ان کے متعلق جو لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عربی اور فارسی علوم میں بڑی نظر رکھتے تھے۔ میر حسن کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اُنھوں نے شیخ محی الدین ابن عربی کی مشہور تصنیف نصوص الحکم " کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اور اُردو نثر میں ایک کتاب بھی لکھی۔ عروض و قوافیہ میں بھی ایک رسالہ تصنیف کیا۔ اور اردو نثر میں ایک کتاب جو اُنھوں نے لکھی اس کا ایک فقرہ میر حسن کے حوالہ سے درج ہے۔

" کل کے دن تھے بادشاہ وزیر۔ " آج کے دن بیٹھے اندھے ہو بصیر!
ایسی دولت سے زینہار زینہار فاعتبروا یا اولی الابصار۔ "

ان کے اشعار کو عام مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ غالباً اسلیے کہ طبیعت میں سخت پسندی تھی۔ اور طرز بیدل کی پیروی کرتے تھے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

عمر رفتہ کا نہ پایا کھوج ہر گز اے کلیم — آپ کو ہر شمع میں ہر انجمن میں گم کیا
لگتی ہے اب تو قلقل بینا سے دل کو ٹھیس — وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا
پاس ناموس محبت ہے مجھے اُن سے کلیم — باغ میں جاؤں نہ ہرگز بے رضا عندلیب
غرور حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہنچے — غرض تم سُن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے

**اشرف علی فغاں :۔** متوفی ۱۷۷۲ء۔ فغاں احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یکتائے زمانہ تھے۔ احمد شاہ نے ان کو ظریف الملک کا خطاب عطا کیا تھا۔ دہلی کی تباہیوں سے پریشان ہو کر مرشد آباد چلے گئے تھے۔ لوٹتے وقت فیض آباد میں ٹھہرے۔ نواب شجاع الدولہ نے بہت اعزاز و اکرام سے لیا۔ مگر زیادہ دنوں نہ نبھ سکی۔ پٹنہ چلے گئے۔ راجہ شتاب رائے نے بڑی قدر دانی کی۔ وہیں ۱۷۷۲ء میں جہان فانی کو خیرباد کہا۔ رنگِ سخن یہ ہے۔ ؎

کیا تو شبِ فراق میں جیتا رہا فغاں
یاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار کا

نے زندگی میں وصل میسر نہ بعدِ مرگ
عاجز ہوا ہوں اے دلِ ناشاد کیا کروں

کیا پوچھتے ہو حال فغاں کا سنا نہیں
خانہ خراب عشق نے دنیا سے کھو دیا

**شاہ ظہور الدین حاتم :۔** ۱۶۹۹ء تا ۱۷۹۱ء حاتم دورِ اول کے بڑے ممتاز اور صاحبِ مرتبہ شاعر تھے۔ ان کی شاعری اس دور کے رنگِ سخن کا بہترین مظہر ہے۔ بقول مصنف تاریخ ادب اردو "ان کو دہلی کے رنگ کا موجد خیال کرنا چاہیئے۔" ان کے والد کا نام شیخ فتح الدین تھا۔ ابتدا میں سپاہی پیشہ تھے۔ میر بادل علی شاہ کا تکیہ جو رند مشرب اور فقیر منش لوگوں کا مرکز اختیار کیا گیا۔ وہاں یہ بھی جایا کرتے تھے۔ طبیعت پر یہ اثر ہوا کہ خود بھی فقیر منش ہو گئے۔ حاتم کو شعر گوئی کا شوق بچپن سے تھا پہلے رمز تخلص کرتے تھے۔ بعد میں حاتم اختیار کیا۔ پہلا کلیات بہت ضخیم ہے۔ اس میں قصائد، رباعیات، غزل، مثنوی، مختلف اصناف کا

کا کام ملتا ہے۔ اس دور کے عام انداز کی طرح اس کلیات میں صنعت ایہام کی بھرمار ہے۔ اور اکثر کلام فحش ہے۔ آخر عمر میں بہ عہد عالمگیر ثانی اس ضخیم کلیات سے منتخب کر کے ایک چھوٹا دیوان مرتب کیا۔ اس کا نام "دیوان زادہ" دیوان زادہ حاتم کے بہتر اور پختہ تر مذاق شعری کا آئینہ ہے۔ حاتم کی بڑی اہمیت اس وجہ سے ہے۔ کہ انھوں نے اصلاحِ زبان کی طرف خاص طور سے توجہ کی۔ "دیوان زادہ کے مقدمہ میں انھوں نے اپنی کاوش اصلاحِ زبان کا حال بیان کیا ہے۔ نئے دیوان میں انھوں نے ایسے الفاظ ترک کر دیئے جو اردو میں نامانوس تھے۔ مثلاً دز، بر، از وغیرہ ایسے الفاظ کو بھی حاتم نے رد کیا جو فی الاصل عربی تھے۔ لیکن عام استعمال میں "تلفظ اور لہجہ کے لحاظ سے ہندی ہو گئے تھے۔ مثلاً تسبیح سے تسبی۔ اور صحیح سے صحی وغیرہ۔ عربی و فارسی کے حروف جو اردو میں دبتے تھے۔ اصلاحات کے سلسلہ میں مقدمہ دیوان زادہ میں لکھتے ہیں۔ اور روزمرہ دہلی کے میرزایاں ہند و فصیحان رند برتتے ہیں۔ میرے قبول طبیعت ہوتے۔ زبان ہندی بھاکا (بھاشا) کو ترک کیا۔ محض روزمرہ کو کہ عام فہم و خاص پسند ہے اختیار کیا۔ ثقیل اور نامانوس الفاظ کو ترک کر دینا۔ عربی و فارسی الفاظ کو املا اور تلفظ کی پوری صحت کے ساتھ برتنا۔ بھاشا کو اردو شاعری کے دائرے سے خارج کر دینا عام فہم اور خاص پسند روزمرہ کو اختیار کرنا حاتم نے اصلاح زبان کے آئندہ کے لئے خطوط قایم کر دیے بتدریج اسی نہج پر اصلاح ہوتی گئی۔ ناسخ نے اس کام کو نقطۂ تکمیل تک پہونچا دیا۔

شاہ حاتم اپنے وقت کے بہت بڑے استاد فن تھے۔ انکے شاگردوں کی تعداد ۵۰ تھی۔ اس فہرست میں سودا کا نام سب سے پہلا ہے۔ حاتم کے مشہور اور منتخب کلام میں زبان بہت سادہ اور دل کش و مؤثر ہے۔ کلام عاشقانہ اور کہیں عارفانہ رنگ میں ہے۔ حاتم کے فیض طبع رواں کے چند نوادر یہ ہیں:

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک
تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک۔

آبِ حیات جا کے کسی نے پیا تو کیا
مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم
کب ملیگا مجھے پیا میرا

ہجر کی زندگی سے موت بھلی
کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا۔

## جان جاناں مظہر

۱۶۹۹ء تا ۱۷۸۱ء۔ جانِ جاناں اس دور کے بڑے معزز و محترم، صاحب وقار و فضیلت با کمال صاحب فن تھے زندگی میں روحانی سرمستی اور اعلیٰ درویشانہ شان تھی۔ طبیعت کا استغنا صفائی قلب کا روشن آئینہ تھا۔ سارے تذکرہ نگار، بلند مرتبہ شاعر اور ارباب کمال ان کے روحانی اور ذہنی کمالات کے معترف ہیں۔ بڑے لطیف مزاج اور سنجیدہ طبیعت اور بڑے خوش تقریر تھے۔ ان کی زندگی عالم ہمہ افسانہ ما دارد کی سچی مصداق تھی۔ شمس الدین نام جانجاناں۔ مظہر تخلص تھا والد کا نام مرزا جان تھا۔ جو عالمگیر کے دربار میں صاحب منصب تھے سلسلہ نسب محمد ابن حنیفہ سے ملتا ہے۔ جو حضرت علیؓ کے بیٹے تھے۔ ماں بیجاپور کے ایک شریف گھرانے سے تھیں۔ پردادا سے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھی۔ ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے۔ کالا باغ علاقہ مالوہ میں

۱۱ رمضان المبارک ۱۱۱۱ھ ۱۶۹۹ء کو پیدا ہوئے۔ عالمگیر کو خبر ہوئی تو فرمایا۔
پسر "جان پدر می باشد" اس کا نام ہم نے جانِ جان رکھا۔ کثرتِ استعمال سے
جانجاناں ہو گیا۔ عین عنفوانِ شباب میں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔
طبیعت دنیوی وجاہت کی طرف مائل نہ ہوئی۔ شوقِ علم اور روحانی طلب نے
ریاض و مشقت کی راہ دکھائی۔ تیس برس مدرسوں اور خانقاہوں کی جاروب کشی
کی علم حدیث اور فقہ کی تحصیل کی نقشبندی مشائخ سے روحانیت میں کسب کمال
کیا۔ مرکز نگاہ عالم ہو گئے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں
ان کے مرید ہو گئے۔

استغنا کی یہ شان تھی کہ کبھی کسی سے نذر نہ لی۔ ۱۰؍ محرم ۱۱۹۵ھ ہجری
۱۷۸۱ء کو ایک شخص کے قاتلانہ حملہ سے بہ شانِ طمانیت مومن شہادت
حاصل کر لی۔ لوحِ مزار پر خود ان کا یہ شعر کندہ ہے۔

بہ لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے — کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

میدانِ شعر و سخن کے بڑے با مرتبہ دل شہسوار تھے۔ تلامذہ میں انعام اللہ
خاں یقین، میر محمد باقر حزیں، احسن اللہ بیان اور بساون لال بیدار جیسے ارباب فن
تھے۔ زبان و ادب کی تاریخ میں مظہر جانِ جاناں کا مرتبہ بہت بلند اور اُنکی حیثیت
بہت بلند ہے۔ انھوں نے اس دور کی مروجہ ایہام گوئی کے عیب سے زبان کو پاک کیا۔ زبان
میں بڑی صفائی اور شستگی پیدا کی۔ فارسی کی نئی نئی اور خوبصورت ترکیبیں اردو شاعری
میں داخل کیں۔ فکر و خیال کے معیار کو بلند کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد اُن کے متعلق آبحیات
میں لکھتے ہیں" لطافت مزاج اور نزاکتِ طبع کا نتیجہ ہے کہ ان کی طرف توجہ کی

اور اُسے ایسا ترا شا کہ جو شعراء پہلے گذرے تھے۔ اُنھیں پیچھے ہی چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا۔ اور اہل زبان کو نیا نمونہ تلاش کر دیا۔ جس سے پراشتہ ابہام گوئی کا زمین شور سے مٹ گیا۔ ان کے کلام میں مضامین عاشقانہ عجب تڑپ دکھاتے ہیں۔ اور یہ مقام تعجب نہیں کہ کیونکہ وہ قدرتی عاشق مزاج تھے۔ اور دوں کے کلام میں یہ مضامین خیالی ہیں۔ ان کے اصلِ حال" مظہر جانجان نے شاعری کے میدان میں ایک نئی راہ دکھائی۔ ایک نیا رنگ سخن قایم کیا۔ جو آگے چل کر معجزانہ شان کے ساتھ ظاہر ہوا۔ ان کا ایک دیوان فارسی میں ہے۔ اردو میں بھی دیوان ہے۔ مگر نا تمام رنگ شعر گوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| ہمنے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار | ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار |
| ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں ایک | جی نکل جاتا ہے جب سُنتے ہیں آتی ہے بہار |
| گر گل کو گل کہوں تو تیرے رو کو کیا کہوں | بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کروں |
| یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے | اگر ہوتا چمن اپنا، باغباں اپنا |

**دور پر ایک نظر** ۔ معاصرین ولی کا دور شمالی ہند میں اردو شاعری کا پہلا دور ہے۔ زبان سے دکنی اثرات زائل ہونے لگے۔ بھاشا کا اخراج شروع ہو گیا فارسی طرز پر ابعد شعر گوئی کی روایتوں کو مضبوط اور مستحکم کرنیکے کام کا آغاز ہو گیا ہندی دوہوں کے اثر سے اس دور میں ابہام گوئی بہت مقبول تھی۔ مظہر جانجاناں نے طرز ابہام گوئی کو ختم کیا۔ اور فارسیت کی لطیف آمیزش سے کلام اور زبان کی شائستگی کا معیار بلند کیا۔ شاہ حاتم نے اصلاح زبان کے خطوط روشن کئے اس دور کے خیالات میں عام طور پر سادگی اور فکر کا فطری انداز ہے۔ یہی سادگی متبادل اور فحش رنگ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ منتخب اشعار میں غزل کی شعری کیفیت ملتی ہے

بعض اشعار خیال و بیان کی حیرت انگیز سادگی کا بہت عمدہ نمونہ ہیں، غزل کے علاوہ دوسرے اصناف پر توجہ بہت کم ہوئی ہے۔

## دورِ سودا و میر

**سودا** — متوفی ۱۷۸۱ء کمالِ فن نے سودا کا شمار شعر و ادب کی زندگی جاوید شخصیتوں میں کیا ہے۔ وہ اس عظمت اور اس پایہ کے شاعر تھے کہ انھوں نے اردو شاعری کو اپنے دورِ کمال سے فارسی ادب کے دوش بدوش لاکر کھڑا کر دیا۔ میر تقی میر جیسے با کمال فن نے جسے اہل ذوق خدائے سخن کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ دل کھول کر سودا کی مدحت سرائی کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ مرآمد شعرائے ہندی، اوست، بسیار خوش گو است، چنانچہ ملک الشعرائی ریختہ اور اشاید۔"

مرزا محمد رفیع سودا کے والد مرزا محمد شفیع بہ سلسلۂ تجارت کابل سے ہندستان آئے اور دہلی میں رہ پڑے۔ یہیں مرزا رفیع پیدا ہوئے۔ اور تربیت و پرورش پائی۔ ذہانت، طبیعت کی جولانی۔ اور فکر کی اوپج بچپن سے نمایاں تھی۔ شعر گوئی کا شوق تھا۔ پہلے سلیمان قلی، داؤد اور پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے۔ مشق فن نے بہت جلد انھیں منصب استادی پر پہنچا دیا۔ ان کے کلام کی عام شہرت ہوگئی۔ علم و ادب کی دنیا ان کی گرویدہ ہوگئی۔ شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام انھیں اصلاح کے لئے دینے لگے۔ اور دہلی جیسے مرکز فضل و کمال میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ دہلی کے روز افزوں ابتری نے انھیں وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ پہلے فرخ آباد گئے اور نواب احمد خاں بنگش کے زیر سایہ زندگی کے چند سال بڑے اطمینان سے گذارے۔ نواب احمد خاں کے انتقال کے بعد فیض آباد چلے گئے۔ والی اودھ شجاع الدولہ نے بڑی آؤ بھگت کی اور تنخواہ مقرر کر دی۔ جب نواب آصف الدولہ

اورنگ زیب ہوئے تو لکھنؤ اودھ کا پایۂ تخت بنا۔ سودا بھی لکھنؤ آئے۔ آصف الدولہ نے جن کی فیاضیوں کا عام شہرہ تھا۔ سودا کو ملک الشعراء کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اور وظیفہ بھی مقرر کردیا۔ یہیں سفرِ آخرت کیا۔ اور آغا باقر کے امام باڑے میں دفن ہوئے

سودا کی حیثیت شعر و ادب کی تاریخ میں بہت بلند ہے انھوں نے کئی حیثیتوں سے اپنے لیے امتیاز خاص حاصل کر لیا ہے۔ کیا باعتبار زبان و بیان اور کیا بہ لحاظ حسن و بلاغت شعری ان کی خدمات کا دائرہ اس قدر وسیع اور مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ بمشکل ہی کوئی دوسرا شاعر اُن سے ٹکر لے سکتا ہے۔

فارسی سے اعلیٰ شاعرانہ معیار پر استفادہ کر کے سودا نے اردو شاعری کو جلوہ گاہ سرو سمن بنا دیا۔ کثرت سے فارسی الفاظ، استعارے، تشبیہیں اور محاورے اردو زبان میں داخل کیے۔ اور اس مشاقی اور قدرت سے داخل کیے کہ حسن زبان بن گئے۔ زبان کا دائرہ بے حد وسیع ہو گیا۔ اور اس کے اندر اعلیٰ معیار کی ادبی شان پیدا ہو گئی۔ سودا نے لحن شیراز کو سرودِ ہندی میں جس شانِ بلاغت کے ساتھ سمویا ہے۔ وہ اُن کا حیرت انگیز ادبی کارنامہ ہے۔ زبان کے سلسلہ میں اُن کے یہاں یہ بات خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ کہ انھوں نے ہندی الفاظ مثلاً کنجل، پربت، رائی وغیرہ استعمال ہوئے۔ ارجن کی بہادری اور کنہیا کے پریم نے بھی اُن کے نگارخانہ تخیل میں جگہ پائی ہے۔ ؎

محبت کے کروں جھنجل کی میں تعریف کیا یارو　　ستم پربت ہو تو اس کو اٹھا لیتا ہے جوں رائی
نہیں ہے گھر کوئی ایسا جہاں اس کو نہ دیکھا ہو　　کنہیا سے نہیں کچھ کم صنم میرا ہے ہر جائی

ترکش الفت سے سینہ عالم کا چھان مارا　　تیری نگہ نے ظالم ارجن کا بان مارا

کاش سودا زیادہ وسعتِ ذوق، انہماک اور گہرائی کے ساتھ ہندی الفاظ تراکیب تمثیلات وغیرہ پر شاعرانہ تصرف کرتے تو اردو کو چار چاند لگ جاتے۔

سودا نے غزل، قصیدہ، مرثیہ، رباعی، ہجو نگاری غرض قریب قریب تمام اصناف سخن کی آبیاری کی اور ابرِ گہر بار کی شان فیض و عطا کے ساتھ کی قصیدہ نگاری فارسی میں انوری، قاآنی اور عرفی جیسے زبردست تخیل رکھنے والے شاعروں کے ہاتھوں ترقی فن کی بڑی دشوار گذار منزلیں طے کر چکی تھیں۔ ان شاعروں نے بڑی لطافتوں نزاکتوں، دیدہ ریزی اور کاوش فکر سے معانی آفرینی کر کے قصیدہ کا بہت اونچا فنی معیار قایم کر دیا تھا۔ اردو میں سودا سے پہلے قصیدہ گوئی کا آغاز ہو چکا تھا۔ سودا نے زور تخیل کا مظاہرہ ایسی دلآویزیوں کے ساتھ کیا اور مبالغہ و معنی آفرینی میں وہ کمال دکھائے کہ بعض بعض مقامات پر انھوں نے فارسی کے مشتاقانِ فن سے بھی بازی جیت لی۔ سودا کی طبیعت میں غضب کی شگفتگی گہرائی اور نکتہ آفرینی تھی۔ ان کی فکر طوفانی کا زور اور سیلاب کی دراکی لے کر اٹھتی اور نگاہ کے میدانوں میں خیال کی گزر گاہوں پر چھا جاتی۔ روانی سخن میں یہ عالم نمایاں ہو جاتا کہ ؎

بادل کے چلے آتے ہیں مضمون مرے آگے
کہتا ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں

سودا کے قصیدوں میں مناظر قدرت کی بڑی دل کش تصویریں ملتی ہیں۔ تصور اور مضامین کی تلاش میں بڑے پھیلاؤ کے ساتھ سرگرم عمل ہوتا ہے۔ اور خود ان کی آفریدہ بہار کے مثل کہ ؎

ڈال سے پات تلک پھول سے لیکر تا پھل
قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض

ایک عالم پر چھا جاتی ہے۔ وقت کی خوبی کہ فکر کی یہ جولانی بیجا مبالغہ آفرینی میں صرف ہو گئی اور اس سے اعلیٰ تر تخلیقی کام نہ لیا جا سکا۔ سوداؔ کی قصیدہ گوئی نے عربی فارسی ہندی اور روزمرہ کے ہزاروں الفاظ اُردو شعر و ادب کو دے دیئے۔ الفاظ کا یہ خزانہ بیان کی یہ شکوہ شکوت، خیال کی یہ معنی آفرینی "شاہنامہ ہند" کو دامن اردو کی زینت بنا سکتی تھی۔

ہجو نگاری کے میدان میں سوداؔ کے اختراع فکر کے کمالات ذہن کی بہت بلند اپج اور نشتریت کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں۔ ہجو کو سوداؔ نے اردو شاعری میں ایک زبردست اور باقاعدہ فن بنا دیا۔ ان کی ہجویات فاخر مکین اور میر ضاحکؔ وغیرہ کے دلوں کو بھی چھیدتی۔ اس زمانے کی ستم رانیوں، اس دور کی دہلی کی تباہی عمال کے مظالم، خلقِ خدا کی بے کسی اور ذہنی انتشار کی تصویریں بھی کھینچتی ہیں۔ دہلی کے کوتوال کی فرعونیت کا بیان۔ ایک اعلیٰ معیار کا بامقصد ادبی طنز ہے۔ سوداؔ کی ہجو نگاری نے دکھا دیا کہ قہقہے، طبیعت کا سیلانی پن، ہنسوڑ بازی بھی فن کے ہاتھوں کے ساتھ درد و اثر پیدا کر لیتی ہے۔ اور صاحب کمال ہنسی ہنسی میں زبان و بیان کے کیسے کیسے اعجاز دکھا دیتا ہے۔

سوداؔ نے مرثیہ میں بھی خوب جدت طرازیاں کیں۔ مرثیہ کو نئی شکلوں میں پیش کیا۔ مرثیہ میں شعریت کے پہلو اور عنوانات پیدا کیے۔ کردار کے مرقعے دکھائے مناظر کی تصویریں پیش کیں، جذبات نگاری کے بھی اچھے پہلو ابھارے۔ مرثیہ کا کمال انیس کا زندۂ جاوید نشانِ عظمت بن گیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے باکمالوں نے مرثیہ میں جو ترقیاں کیں وہ بھی ادبی قدر و عزت کے مستحق ہیں۔

سوداؔ جہاں رنگ و بو کے آدمی تھے۔ طبیعت میں قیامت کی ظرافت اور شگفتگی

تھی۔ تخیل شوکت اور پھیلاؤ کا دلدادہ تھا۔ لمعہ خورشید کی چھوٹ دیکھنے والی نگاہیں معمولی تارے کے ٹوٹنے کا منظر مشکل سے دیکھتی ہیں۔ دل کی گہرائیوں کے جذبات کی قیامت، شور، ہنگاموں، ہمہموں، بجلی کے لپکوں اور بادلوں کی گرج میں نہیں ہوتی۔ نم چشم میں ہوتی ہے۔ سانس کے بظاہر بے معنی سے الجھاؤ میں ہوتی ہے۔ میر اس نگاہ اور اس رنگ کا آدمی تھا۔ تغزل کی دنیا میں خدائے سخن بن گیا۔ سودا نے بندش کی چستی۔ بیان کی بلاغت نزاکت خیال کی حسن آفرینی اور تشبیہہ و استعارہ کی سحر طرازیوں سے غزل میں خوب خوب بہار طبیعت دکھائی۔ اچھے اچھوں سے بہتر معیار پر غزل کہی لیکن وہ میر کا "شیوہ گفتار" کہاں۔ یوں سودا کی غزل گوئی بڑے اونچے درجے کی چیز ہے۔ اس کے یہاں ایسے اشعار موجود ہیں۔ جن میں فکر کی نگاہ تیز درد کی چوٹ اور دل کا گداز ہے۔ جس نے یہ اشعار کہہ دیئے ہوں کہ ؎

بھلا گل تو تو ہنستا ہے ہماری بے ثباتی پر
نہ روتی ہے کس کی ہستی موہوم پر شبنم

آئے جو بزم میں تو اٹھا چہرے سے نقاب
پروانے کو ہی شمع سے بے زار کر چلے

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ!
کیا جانیئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

یقیناً غزل میں اس کی حیثیت بہت بڑے شاعر کی ہے۔

# میر تقی میر

خدائے سخن میر تقی میر کا نام اُردو غزل کی جاوداں زندگی کا ضامن ہے۔
دل کے نازک الم انگیز، جان لیوا جذبات کی مصوری، جس مہارت فن کے ساتھ
اس باکمال نے کی ہے وہ اردو شعر و ادب کا نہ مٹنے والا اعجاز ہے۔ جذبے کی
گہرائیوں میں ڈوب کر من کے موتی اُچھال دینے والا ہر فن کار امر ہو جاتا ہے
میر عظمت کی راہ پر میر کارواں بنا نظر آتا ہے۔

میر محمد تقی نام اور میر تخلص تھا۔ ان کے والد کا صحیح نام معلوم نہیں، عرف
علی متقی تھا۔ بڑے صاحب باطن اور درویش طبیعت انسان تھے۔ آخر عمر میں
ترک دنیا کر کے اپنے وطن اکبر آباد (آگرہ) میں خانہ نشین ہو گئے باپ نے میر تقی
کو ابتدا ہی سے اپنے ڈھنگ پر لگایا۔ لذت دنیا سے بے نیاز اور عشق مولا میں
سرمست و سرشار ہونے کی تعلیم دی۔ باپ کے رنگِ تعلیم کو اُن کے معتقد سید امان اللہ
نے اور پختہ کر دیا۔ میر کے ذہن و فکر میں محبت کے کائنات گیر تصور نے ایک
لذت بخش وجدانی حقیقت مختلف پہلوؤں سے اُبھری چمکی، اور رنگ لائی
محبت کی ہمہ گیر کارفرمائی میر کے یہاں نورِ عقیدہ بن کر روشن ہے۔ ؎

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو
سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق

دس برس کا سن تھا۔ کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بڑے بھائی نے
برادرانِ یوسف کی طبیعت پائی تھی۔ مجبور ہو کر تلاشِ معاش میں نکلے۔ دہلی
میں اُن کے رشتہ کے خالو نامور محقق و شاعر، خان آرزو نے اپنے یہاں ٹھہرایا۔

کچھ دنوں حصولِ تعلیم کا موقع ملا۔ خان آرزو بھی در پے آزار ہو گئے۔ زندگی وبالِ جان بن گئی۔ مصائب نے ذہن کا توازن بگاڑ دیا۔ جنون کی سی حالت ہو گئی۔ چاند میں ایک عجیب سی صورت نظر آنے لگی۔ طبیعت کی بے اطمینانی۔ ذہن کا انتشار، آئے دن کی محتاجی، دل برداشتہ ہو کر آگرہ لوٹ آئے۔ لیکن غم کے مارے کو چین کہاں امید نے پھر دہلی کھینچ بلایا۔ زمانے کے الم سہے۔ دہلی کی تباہیاں دیکھیں۔ صدیوں کی جمی جمائی محفل اُجڑ رہی تھی۔ جہاں روز و شب ہن برستا تھا۔ اب موت اور تباہی کے بھوت منڈلا رہے تھے۔ دہلی والوں نے اور شاہ دہلی نے میر کی شاعرانہ عظمت کے سامنے سر جھکا دیا۔ بڑی تعظیم و تکریم کی۔ لیکن عام تباہی کے اس دور میں زمینِ دہلی پر بہ فراغت زندگی گذارنے کا سامان نہ ہو سکا۔ جب تک ہو سکا تحمل کیا۔ آخر کار ۱۷۸۳ء میں سینہ پر پتھر کی سل رکھ کر دہلی چھوڑ دی۔ لکھنؤ آئے۔ آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ بڑا اعزاز ہوا۔ وظیفہ مقرر ہو گیا۔ لیکن محبت کی چوٹ اور دہلوی آفتوں کی تابڑ توڑ مار نے مدت ہوئے بے دل کر کے رکھ دیا تھا۔ دل کی کلی مرجھائی رہی۔ یہیں لکھنؤ میں ۱۸۱۰ء میں جہانِ فانی کو خیر آباد کہا۔ اتنا بڑا کمال اور آج کوئی یہ بتانے والا نہیں کہ قبر کونسی ہے۔ سہ

طمعِ فاتحہ از خلق ندریم نیاز　　　عشق من از پس من فاتحہ خوانم باقیست

میر نے بڑی طویل عمر پائی تھی۔ تھے بھی پُر گو۔ میر کی تصانیف کی تعداد کثیر ہے غزلوں کے چھ ضخیم دیوان کے علاوہ متعدد مثنویاں اور قصائد موجود ہیں، دیوانوں میں غزلوں کے علاوہ، رباعیاں، مستزاد، واسوخت، مخمس، مسدس ترجیع بند۔ غرض کہ مختلف اصنافِ سخن موجود ہیں۔ ایک فارسی کا دیوان بھی ہے۔ میر صاحب

کو واسوخت کا موجد قرار دیا گیا ہے۔ اردو نظم میں ان کی ایجادات اور بھی ہیں اُن
سے ان کی مشاقی سخن ہمہ گیر انداز شعر گوئی کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن میر کی حقیقی
عظمت اور شہرت کی بنیاد ان ایجاد پر ہے، ورنہ قصیدہ گوئی پر بے شک انکی
مثنویوں میں اپنے بعض مصائب زندگی کو بڑی رقت پسندی کے ساتھ نظم کیا ہے
میر اپنے وجود اور اپنے جذبات میں ڈوبے ہوئے انسان تھے۔ خارجی دنیا سے اُن کا
لگاؤ کبھی لذت و انبساط کے عنوان سے قائم نہ ہو سکا۔ یہ دنیا ان کے دائرہ فکر میں
کبھی موج طبیعت بن کر نہ اُبھر سکی۔ اُن کا تصور اور قوت شعر گوئی ہمیشہ آپ بیتی
پر صرف ہوتی رہی۔ اس لئے اُن کی مثنوی نگاری میں سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ
خارجی زندگی کے مناظر قریب قریب ناپید ہیں۔ میر کی جگ بیتی میں بھی آپ بیتی ہے
کہ بڑے نغمۂ سرائی الم ہے[1]

میر کا حقیقی کمال شاعری غزل میں ظاہر ہوا ہے۔ وہ ایک خوددار، حساس
طبیعت، اپنے تجربات میں کھوئے ہوئے انسان تھے۔ تصوف کی تعلیم نے اس
رنگ طبیعت کو چمکایا۔ زمانے کے حوادث نے اس کو نازک تر بنایا۔ اور محبت کی
ناکامی نے خستگی بخشی۔ اور خود شعری کے پہلوؤں کو ان کے دل و دماغ پر اپنی اثر انداز ہے

---

[1] میر آپ بیتی میں لکھتے ہیں "دنیا عجیب حادثہ گاہ ہے۔ کیسے کیسے مکان خراب
ہو گئے۔ اور کیسے کیسے جوان مر گئے۔ کیسے باغ تھے کہ ویران ہو گئے۔ اور کیا کیا محفلیں
تھیں جو افسانہ ہو گئیں۔ کیسے کیسے پھول کملا گئے۔ کیا کیا لوگ گذر گئے۔ کیسی کیسی
مجلسیں اکھڑ گئیں۔ کیسے کیسے قافلے کوچ کر گئے۔ عزیزوں نے کیا کیا خرابیاں دیکھیں
اور کیسے کیسے جوان جانوں کی بازی ہار گئے۔ ان عبرت کی آنکھوں نے کیا کیا دیکھا
اور ان سننے والے کانوں نے کیا کیا سنا"

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

کار فرما۔ اور مستولی کر دیا۔ کہ اُن کے جہانِ شاعری میں جاوداں درد و کرب کا جادو جاگ اُٹھا۔ نغمۂ میر کی عظمت کا راز یہ ہے کہ ان کے یہاں ٹوٹے ہوئے دل کی پکار، سینہ بریاں کا نالۂ حشر خیز، نشتر زدہ ذہن کی نوائے احتجاج فن کے انتہائی فطری بے ساختہ اور شدید عمل کے ساتھ قالبِ شعر میں ڈھلی ہیں۔ وہ دل کی دھڑکنوں کو شعری ترنم کی لہروں میں اس کمال بے ساختگی کے ساتھ سمو دیا ہے کہ اس کا نغمہ بہارین کے چاند کے کرن کی طرح دل میں برچھی بن کر اُتر جاتا ہے۔ کتنی لطیف، کتنی نازک کاٹ لیکن کیسا جان لیوا اثر یہی ہے۔ فن کا وہ اعجاز جس پر وجدانِ سلیم نے ہمیشہ سر دھنا رہے گا۔

میر کے بہترین اشعارِ غزل ہیں جنہیں میر کے نشتر کہا جاتا ہے۔ بالکل سچے جذبات اور محبت کے حقیقی تجربات ہیں۔ ان کی نشریت، زبان و بیان کے حقیقی فطری اسلوب کی رعنائیوں اور شانِ اثر کو چمکاتی ہوئی ظاہر ہوئی ہے۔ سادہ نرم میٹھے الفاظ طرزِ نگارش یہ کہ جیسے کوئی سامنے کی بات کہہ رہا ہے۔ تلاشِ معنی کے لئے خیال کو نہ بڑی پرواز کی ضرورت ہے۔ نہ بڑی کاوش کی حاجت۔ دل کی بات دل کی زبان میں بجز اعجاز سادہ، بحد حیرت مؤثر۔ سے

منہ تکا ہی کرے ہے جس تس کا　　حیرتی ہے یہ آئینہ کس کا۔
شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے　　دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۱ کا)

ہر کاسہ سر ز افسانہ می گوید　　ہر کنہ خرابہ ز درے می گوید
دنیا ست فسانہ پارۂ ما گفتیم　　واں پارہ کہ ماز دیگرے می گوید

اس تھوڑی مدت میں اس ایک قطرۂ خون نے جسے دل کہتے ہیں طرح طرح کے ستم جھیلے اور تمام خون ہو گیا۔ ذکر میر صفحہ 191 (اردو ترجمہ)

شاعر تھے۔ درد دہلی میں پیدا ہوئے اور والد کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی درویشانہ تعلیم و تربیت نے تصوف و روحانیت کو طبیعت کا مذاق اور نگاہ و دل کا نور بنا دیا۔ بائیس برس کے سن میں دنیا سے منہ موڑ کر والد کے سجادہ پر بیٹھ گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی پر آئے دن تباہیاں آ رہی تھیں۔ مصائب سے گھبرا گھبرا کر اکثر امراء شرفاء اور اربابِ کمال گھر بار اور شہر چھوڑ چھوڑ کر دوسرے شہروں میں جا بسے اس مردِ باخدا کے توکل کا یہ عالم کہ پائے استقلال کو جنبش نہ آئی۔ اپنے سجادۂ درویشی پر شان بہ اطمینان جمے بیٹھے رہے۔ اور یہیں اڑسٹھ برس کے سن میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

قدرت نے طبیعت میں علم و ادب کا بڑا شائستہ بلند اور نکھرا ہوا مذاق ودیعت کیا تھا۔ ادب اور تصوف کے علاوہ موسیقی میں یہ کمال حاصل کر لیا تھا کہ بڑے بڑے باکمال گوّیے اپنی اپنی چیزیں بنظرِ اصلاح لا کر سنایا کرتے تھے۔ فارسی نثر میں کئی رسالے اور کتابیں ان کے قلم سے نکلیں فارسی دیوان بھی موجود ہے۔

اردو دیوان اگرچہ مختصر ہے لیکن بقول میر حسن مثلِ کلام حافظ سراپا انتخاب ہے خواجہ میر درد کی زندگی عبادت، ریاضت اور سچی خداپرستی اور للہیت سے معمور تھی۔ اُن کا کلام، اُن کی طبیعت اور رنگِ مزاج کا شفاف آئینہ ہے۔ انھوں نے نہ کسی کی شان میں قصیدہ کہا، نہ کسی کی ہجو لکھی اور نہ کوئی عشقیہ مثنوی صرف غزلیں کہیں۔ جن میں پاکیزگی روح اور عشقِ الٰہی کی جلوہ گری ہے۔ خیالات میں بلندی، نفاست اور تصوف کی چاشنی ہے۔ زبان بہت صاف اور دھلی ہوئی ہے۔ چھوٹی بحروں میں ان کی غزل گوئی کا کمالِ طبیعت کے گہرے رچاؤ کے ساتھ ظاہر ہوا ہے۔ درد کے کلام کی شستگی اور تاثیر پر آزاد نے آبِ حیات میں بہت مختصر مگر نہایت لطیف اور جامع تبصرہ ایک فقرے میں

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میر کے یہاں اعلیٰ کمالاتِ فن کی بڑی فطری نمود ہے۔ جذبہ کی فطری اور روح، بحورِ لفظوں اور اسلوبِ بیان کے انتخاب میں صاف پڑی جھلکتی ہے جذبہ کا جھکاؤ رکاؤ کا انداز اضطرار، بیتابی اشعار کے صوفی ترنم میں داد حاصل کر لیتے ہیں۔

ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہو کیا نہیں
تم کو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

جذبہ کا جلال یہ ہیبت ناک منظر پیش کرتا ہے۔ کہ ؎

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں صحرا صحرا وحشت ہے

میر کے تغزل کی لطافت، بلندی، فن اور اثر آفرینی اردو شاعری کے معرکہ آرا ادبی فتوحات میں ہیں۔ ؎

برسوں لگی رہی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب ہم سا کوئی صاحب، صاحب نظر ہوئے ہے

---

# خواجہ میر درد (متوفی ۱۱۹۹ھ)

اردو کے صوفی شعراء میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت خواجہ میر درد کو حاصل ہے۔ ان کی بلند پاکیزہ اور روحانی ذوق نے اردو کو نکھارنے سنوارنے اور اچھے مذاق محبت ہے۔ بہرہ ور کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ سید خواجہ میر نام اور درد تخلص تھا۔ اُن کے والد خواجہ محمد ناصر عندلیب اچھے مرتبے کے روحانی بزرگ اور فارسی کے بڑے خوش مذاق

کر دیا ہے فرماتے ہیں۔ "تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھری ہے"۔ درد کے فن کی پاکیزگی اور بلندی پر بہت اچھی روشنی ڈالتا ہے۔ فارسی اور اردو دیوان کے علاوہ خواجہ صاحب نے تصوف اور روحانیت کے مسائل پر کئی رسالے تصنیف کئے یہ رسائل فارسی میں ہیں اور ان سے اُن کی علمیت اور ادبی مشاقی کا اچھا اندازہ ہوتا ہے۔

## سوز (سنہ ۱۷۲۰ء تا سنہ ۱۷۸۹ء)

سید محمد میر نام، سوز تخلص، میر ضیاء الدین کے بیٹے اور قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ بڑے ذہین باحوصلہ اور دلیر طبیعت تھے۔ فنون سپہ گری میں اعلیٰ درجے کی مہارت رکھتے تھے۔ خوشنویسی میں بھی اچھا کمال حاصل کیا تھا۔ دہلی کی تباہیوں نے انھیں بھی وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ گردشِ تقدیر نے انھیں خوب پھرایا۔ پہلے فرخ آباد گئے مگر زیادہ دنوں نہ ٹھہر سکے۔ سفر اول میں لکھنؤ بھی ہاتھ نہ آیا۔ مرشدآباد چلے گئے۔ وہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی۔ دوبارہ لکھنؤ آئے۔ اب ان کی تقدیر چمکی۔ بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ نواب آصف الدولہ شاگرد ہوئے۔ لیکن زیادہ دن نہ گذرنے پائے تھے کہ موت نے زندگی کی بساط اُلٹ دی۔

سوز کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ مثنوی، رباعیاں اور مخمس بھی ہیں ان کے کلام کا سب سے نمایاں وصف زبان کی سادگی، صفائی اور فکری بے تکلفی ہے۔ ان کے یہاں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کی بھرمار نہیں۔ سیدھے سادھے ہندی لفظ بے ساختگی سے باندھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کر رہے ہیں۔ محاورے اس خوبی سے صرف کرتے ہیں کہ بے اختیار شعر میں دلآویزی کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ سوز کا انداز شعر گوئی غزل سے فطری مناسبت رکھتا ہے آزاد کی رائے چھپی تلی ہے۔ "میر سوز کی زبان عجیب میٹھی ہے۔ اور حقیقت میں غزل

کی جان ہے۔ ان کی انشا پردازی کا حسن تکلف اور صنائع مصنوعی سے بالکل پاک ہے

نمونۂ کلام:-

اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیبوں کا مگر
سوز کے نام کو لکھ لکھ کے مٹا دیتے ہیں

کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز آ
دیکھا زمانہ تو نے نادان عاشقی کا

کعبہ کا ہی قصد اب یہ گمراہ کرے گا
جو تم سے بتو ہوگا سو اللہ کرے گا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا لاشہ جس جا گر پڑے گلزار پیدا ہو

## میر حسن (متوفی ۱۷۸۶ء)

میر حسن کا شمار اردو کے چوٹی کے شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ ان کی مثنوی "سحر البیان" شعر و ادب کی تاریخ میں زندہ جاوید نام حاصل کر چکی ہے۔ ان کا نام غلام حسن میر اور تخلص حسن تھا۔ میر کے نام سے مشہور ہوئے۔ میر غلام حسن ضاحک کے بیٹے تھے۔ ذوقِ شعر و ادب خاندان سے ذہنی ورثہ میں ملا تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے بارہ برس کے سن میں والد کے ساتھ فیض آباد آئے۔ کچھ دنوں بعد لکھنؤ میں منتقل ہوئے یہیں ساری عمر گذاری۔ جیسا کہ خود لکھا ہے کہ میر ضیاءالدین ضیاء کے شاگرد تھے۔ لیکن ان کی روش نبھ نہ سکی۔ طبیعت کی مناسبت سے مشق سخن میر درد، میر سودا اور میر تقی میر کے رنگ میں کی۔

تصانیف کے علاوہ دیوان کے گیارہ مثنویاں، قصائد، مرثیے اور اردو شعراء کا فارسی زبان میں ایک تذکرہ ہے۔ قصائد میں حسن کو کوئی شانِ امتیاز نہ حاصل ہو سکی۔ ان کا معیارِ غزل گوئی ستھرا، لطیف اور بلند ہے۔ اور تصوف کی چاشنی زبان و بیان کی سادگی اور نگاہ حسن آشنا کے اثر نے کلام کو دلآویز اور مؤثر بنا دیا ہے۔ ان کے منتخب اشعار غزل میں جذبہ کی فطری تڑپ اور جوہر طبیعت کی حقیقی نمود ہے۔ سہ

نہ رکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو — حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

اس شوق کے جانے سے عجب حال ہے میرا — جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا

نغمۂ عشق سے ہیں سبحہ و زنار ملتے — ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

کیا جانے اُس کے جی پر کیا کچھ خیال گزرا — کچھ آپ ہی آپ اپنے دل پر ملال گزرا

اظہار خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

یوں تو ان کی دوسری مثنویاں بھی لطف و لذت سے بہرہ ور ہیں۔ لیکن اس صنف میں ان کی بہترین تصنیف مثنوی "سحر البیان" ہے۔ جو ادب کا ایک لافانی شاہکار ہے نام پرانے تذکرہ نویس اور دور حاضر کے نقاد اس مثنوی کی سحر بیانی، زبردست شاعرانہ کمالات اور اعجاز فن کے معترف ہیں۔ حسن نے بدر منیر اور بے نظیر کی داستان محبت بڑی میٹھی، رسیلی اور جادو اثر زبان میں سُنائی ہے۔ کرداروں میں زندگی کی منیاں شانِ نمود اور رعنائی ہے۔ جذبات کی تصویر کشی کا یہ عالم ہے کہ احساس دل کی نزاکتیں پیکر شعر میں کھنچ آئی ہیں۔ مناظر فطرت کی رنگینیاں، معاشرت و تمدن کی بولتی ہوئی تصویریں بیان کا زبردست تسلسل اور روانی زبان کی یہ حیرت انگیز سادگی کہ قیدِ زماں سے بلند ہو کر مایہ لذت ابد بن جائے۔ حسن کی مثنوی اردو نظم کا آئینہ کمال ہے۔

## قائم چاند پوری

متوفی مابین ۱۷۹۴ء و ۱۷۹۵ء

---

قیام الدین نام، قائم تخلص چاند پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے۔ زندگی کا بیشتر حصہ دہلی میں گذرا۔ دہلی کی تباہیوں نے انھیں بھی ہجرت کرنے پر مجبور کیا۔ زندگی کا آخری زمانہ رام پور میں گذرا۔ اور وہیں انتقال کیا۔ کلام پہلے خواجہ میر درد کو دکھاتے تھے۔ بعد میں سودا کے شاگرد ہو گئے۔ مشق و ریاض نے رنگ کلام کو یوں جلا دی کہ ہم رنگ سودا ہو گیا۔ ان کی فکر میں بڑی قوت اور اسلوب میں بڑی دل کشی ہے۔ بعض بعض تذکرہ نگاروں نے ان کے کمال سخن گوئی کو سودا کے ہم مرتبہ قرار دیا ہے۔

قائم نے غزلوں کے علاوہ قصائد اور عشقیہ مثنویاں بھی کہی ہیں۔ فارسی زبان میں اردو شاعروں کا ایک تذکرہ بھی ان کی یادگار ہے۔ نمونۂ کلام ؎

معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا کون
پیامبر کے نہیں ساتھ آپ جاتا تھا

مے کی توبہ کو مدت ہوئی قائم لیکن
بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا
آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار میں بیمار بہت

محفل وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے میخانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

## انعام اللہ خاں یقین (متوفی ۱۷۵۵ء)

انعام اللہ خاں یقین اس دور کے بڑے خوش مزاج شاعر تھے۔ مرزا مظہر جانجاناں سے تلمذ و اصلاح تھا۔ عین عالم شباب تھا کہ پچیس برس کی عمر میں جہان فانی سے منہ موڑ لیا۔ یقین کے تخیل میں بلا کی جدت طرازی اور کلام میں پختگی ہے یقین کو شعر گوئی کا اصلی جوہر ملا تھا۔ ان کی زبان بہت صاف و شستہ ہے متروک الفاظ کا ان کے یہاں بہ مشکل گذر ہوتا ہے۔ مشاقی فن سے کلام میں خوب خوب دلآویزیاں پیدا کرتے ہیں۔ طبیعت کی شوخی اور شگفتگی سے رنگ بیان نکھرتا ہے اور فکر کے لطف عمل سے حسن طبیعت کی دلکشی نمود ہوتی ہے۔ کم عمر شاعر کی مشاقی اور پختگی فن نے یہ شبہ پیدا کر دیا کہ یہ کلام ان کا نہیں مظہر جانجاناں کا ہے لیکن مستند تذکرہ نگاروں نے اس کی تردید کی ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے ؎

بہار آخر ہوئی اب تو سینے دے گریبانوں کو
یقیں کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

یقیں مارا گیا جرم محبت پر زہے طالع
شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اسکو کہتے ہیں

کعبے ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

# دورِ انشا و مصحفی

## میر انشاء اللہ خاں انشا — متوفی ۱۸۱۷ء

اردو زبان و ادب کے ارباب فضل و کمال میں انشاء کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ولادت مرشد آباد میں ہوئی ان کا والد میر ماشاء اللہ خاں نے ان کی تربیت علمی ڈھنگ پر کی۔ انشاء کی طبیعت میں شوق علم، ذہانت کا مادہ اور اختراع و ایجاد کا حوصلہ فطری اور اس قدر وافر تھا کہ مناسب تربیت سے یہ شانِ کمال چمک اٹھا۔ خداداد ذہانت نے شاہراہ کمال کی نشاندہی کی۔ اور دماغ کے جوہر کھلنے لگے۔ شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ کبھی کبھی والد سے اصلاح لے لیتے تھے۔ زیادہ تر اپنے مذاق شعری پر اعتماد کرتے۔ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں مرشد آباد چھوڑ کر دہلی آئے۔ شاہِ وقت شاہ شطرنج سے زیادہ باحیثیت نہ رہ گئے تھے۔ بے دست و پا دوسروں کے زیر سایہ، خزانہ خالی، بقول آزاد اس وقت دلی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور سجادہ نشین اس کے شاہ عالم بادشاہ تھے۔ اہل دہلی نے انشاء کی بڑی قدر و منزلت کی، دربار میں رسائی ہوئی۔ نمود ذہانت اس بانکپن اور جوہرداری کے ساتھ ہوئی کہ دربار میں ان کا طوطی بولنے لگا۔ زود طبیعت، شگفتہ دلی، شوخی مزاج اور ذوقِ لطافت آفرینی نے انھیں شمع انجمن بنادیا۔ لیکن دہلی میں خالی عزت ہی عزت تھی۔ بقدر طلب و ضرورت وسیلہ آمدنی کہاں۔ ناچار انشاء نے بھی دلی چھوڑ دی۔ لکھنؤ آئے مرزا سلطان شکوہ کے دربار نے بڑے اعزاز و وقار کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ سلیمان شکوہ جو پہلے مصحفی کے شاگرد تھے انشاء سے اصلاح سخن لینے لگے۔ خوب رنگ جما۔ طلب عیش نے انشاء کے حوصلوں کو فراخ کر دیا۔ دھیرے دھیرے نواب سعادت علی خاں کے دربار میں رسائی ہوئی۔ فکر کی جولانی جو آسمان سے تارے توڑ لاتی

تھی۔ دربار اودھ کی رونق بن گئی۔ والیِ اودھ کی صحبت میں ساری ذہانت دربار عیش
کی نذر ہو گئی۔ انشا خوب ہنسے۔ اہل دربار کو خوب ہنسایا۔ لیکن یہاں تک بڑھی
کہ قہقہوں کی سنسناہٹ پیالوں سے سیل گریہ ابل پڑا۔ وفور لطف و مزاح میں نواب سے شکر رنجی
ہو گئی۔ عیش، فارغ البالی۔ لطف و مزاح سب رخصت ہو گئے۔ اور یہ حال شگفتگی
کے پھول برسانے والا انشا باد بہاری سے یہ جانکاہ شکوہ کرتے ہوئے کہ۔ سے

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی    تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

راہی ملک بقا ہو گیا۔

انشا نرے شاعر ہی نہیں تھے۔ بڑے پایہ کے عالم بھی تھے۔ اور اعلیٰ درجہ کی ذہنی اپج بھی رکھتے تھے۔ کئی زبانیں جانتے تھے۔ ایک قصیدہ لکھا ہے۔ جو سات زبانوں میں ہے۔ ان کی مشہور نثری تصنیف "دریائے لطافت" اردو قواعد کی پہلی کتاب ہے۔ اور اس سے ان کے کمالِ زباندانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک افسانوی طرز کی کتاب "رانی کیتکی کی کہانی" لکھی اس قید کے ساتھ کہ کوئی عربی و فارسی کا لفظ نہ آنے پائے۔ قدرتِ فن اور مشاقی کلام کا اظہار خوب خوب کیا ہے۔ اور بڑے نرالے اندازوں سے کیا ہے۔ ایک مثنوی بے نقط لکھ ڈالی جس کی سرخیاں بھی بے نقط ہیں۔ اردو کو ہندی رنگ دینے کی طرف مائل ہوئے تو اس میں بھی خوب خوب جدت طرازیاں کیں بعض اصناف سخن کے نام ہندی رکھے مثلاً مثلث کو تکڑا اور رباعی کو چوکڑا کہا۔ اسی طرح بحروں میں مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن، مفاعیلن کی جگہ۔ پری خانم، پری خانم، پری خانم، پری خانم۔ اور فاعلن، فاعلن، فاعلن، فاعلن کی جگہ چت لگن، چت لگن، چت لگن، چت لگن کو رائج کیا۔ عربی و فارسی ترکی کے ساتھ ہندی زبانوں مثلاً بھاشا۔ پنجابی۔ مرہٹی۔ وغیرہ پر بھی قدرت تھی۔ ذوق اختراع کا یہ عالم تھا کہ جس راہ میں قدم ڈال دیتے میر کارواں بن کر چلتے۔ الفاظ کا بڑا زبردست

خزانہ ذہن کے سامنے موجود رہتا۔ نگاہِ عالم مشاہدات کی لطافتوں میں پڑ جاتی اور فکر جب اپنی جولانی پر آتی تو سینۂ انجمن کی دھڑکنوں کو خیالات میں سمو دیتی۔ انشار کا علم زباندانی اور ادبی کمال آفرینیاں اس مرتبہ کی تھیں کہ اگر زمانہ موافق اور طبیعت سنجیدہ ادبی تخلیق کے کام میں پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ مصروف ہو جاتی تو اردو ادب کا صحیح ہندی مزاج بن جاتا۔ اور شاندار ادبی روایات کے ساتھ بن جاتا۔ صلاحیتوں کے اعتبار سے انشار اس کام کے لئے سودا اور نظیر اکبر آبادی دونوں سے زیادہ بہتر اور موزوں تھے۔ ادب کی بدنصیبی کہ انشار اپنی قیمت کمال نہ پہچان سکے۔ اور من کی موج میں وہ متاع گرانمایہ قہقہوں کو دے بیٹھے۔ جو فضائے ادب میں چاند تاروں کا نور بن کر چمک سکتی تھی۔

انشار بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور خوب خوب کمال طبیعت دکھایا ہے۔ ہندی کے نرم شیریں الفاظ کو بڑی آزادی سے برتا ہے۔ ماحول کی نشاط پسندی انشا کے یہاں صاف، پڑی چھلکتی ہے۔ شوخی، ظرافت، ہجو، طبیعت کی رنگین بانکپن کی خوب خوب جلوہ آرائی ہے۔ کلام انشا پر آزاد کی رائے بہت جامع اور بھرپور ہے۔ فرماتے ہیں۔ "غزلوں کا دیوان عجیب طلسمات کا عالم ہے۔ زبان پر قدرت کامل بیان کا لطف، محاوروں کی نمکینی ترکیبوں کی خوشنما تراشیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہیں، ابھی کچھ ہیں۔ جو غزلیں یا غزلوں کے اشعار با اصول ہو گئے وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی وہاں ٹھکانہ نہیں۔"

# مصحفی
(۱۷۵۰ء تا ۱۸۲۴ء)

مصحفی کا شمار باذفار اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ ان کا نام غلام ہمدانی اور تخلص مصحفی تھا۔ امروہہ کے رہنے والے تھے۔ ابتدائے شباب میں وطن چھوڑ کر دہلی آئے جہاں بڑے ذوق و شوق اور ریاضت و محنت سے تکمیل علوم کی شعر گوئی اس زمانے میں شرفائے اور اہل علوم کا خاص شغلہ تھی مصحفی نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ اپنے مکان پر بھی محفل مشاعرہ کرتے۔ جس میں تمام معزز شعرار شرکت کرتے تھے۔ تنگ دستی، پریشان حالی۔ کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھوں نے بھی دہلی چھوڑی۔ نواب آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ آ گئے۔ شنایانِ مرتبہ نہ سہی۔ بہر حال مدارت ہوئی۔ مرزا سلیمان شکوہ کے کلام پر اصلاح دینے لگے۔ اور اُن کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ سید انشا کی آمد لکھنؤ کے بعد اُن کا رنگ پھیکا پڑنے لگا۔ وقار کے ساتھ ساتھ تنخواہ بھی کم ہوئی مصحفی صاحب فن استاد تھا۔ صدمہ نے دل توڑ دیا۔ انشار سے ایک نزاع کی صورت قایم ہو گئی۔ جس نے آگے چل کر بہت گھناؤنا رنگ اختیار کر لیا متین و سنجیدہ طبیعت مصحفی کو آبرو بچانا مشکل ہو گئی۔ انشار اور مصحفی کے شاگردوں نے خوب مذاق و تمسخر کے ہنگامے کیے۔ جو بعض اوقات اس قدر فحش ہو گئے کہ شرافت اور ادب کی آنکھیں جھک گئیں۔

مصحفی اپنے دور کے بڑے معزز، باوقار مرتبہ، صاحب فن استاد تھے۔ بہت زود گو اور پر گو تھے۔ مشاعروں کے لیے بکثرت غزلیں کہہ رکھتے اور وقت آنے پر بیچ ڈالتے۔ اس زود گوئی اور پر گوئی نے ان کے فن کو بہت نقصان پہنچایا سچے معیاری ادب کی تخلیق کے لیے جس محویت، عالم خود رفتگی اور ذہن کے سطحِ عام

سے بلند با وقار مسلسل عمل کی ضرورت ہے ۔ وہ زود گوئی اور پُر گوئی کی مصحفی کے کلام میں ناہمواری پیدا کردی۔ مصحفی نے مختلف استادوں کے رنگ میں شعر کہے رو میں بہ مشکل حاصل ہو سکتا ہے ۔ اسی زود گوئی اور پر گوئی نے اور قدرت فن کے کمالات دکھائے۔ سودا کی شوکت بیان میر کا درد و گداز سوز کی سادگی وپرکاری فغاں کی رنگینی مصحفی کے کلام میں جلوہ ہزار رنگ ہے ۔لیکن اس بہار نیرنگی میں ان کا اپنا خاص رنگِ طبیعت بھی صاف نمایاں ہے ۔ ایک فاضل عصر نے بالکل صحیح کہا ہے ۔کہ ان کی امتیازی خصوصیت "نشاطِ شباب" اور "رنگ و روپ" کو نہایت پُر کیف اور رنگین طریقے سے بیان کردینا ہے۔ اُن کے قصائد مہارت فن کا اچھا نمونہ ہے ۔ زورِ تخیل، دقتِ فکر، لطیف تراکیب شاندار الفاظ قصیدہ نگاری کے اکثر عناصر سے اُن کے قصائد بہرہ ور ہیں ۔ لیکن سودا کا جوش وخروش اور جولانی فکر کی فطری بے ساختہ اور ہمہ گیر نمود ناپید ہے ۔ انکی ایک مثنوی بھی لکھی ہے ۔ بحر المحبت "میر کی مشہور مثنوی" دریائے عشق کے رنگ میں بلکہ اس کی نقل مصحفی کی استادانہ حیثیت اور مشاقی فن کا بالکل مسلم ہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اُن کا معیار شعر گوئی سودا، میر اور میر درد سے فروتر ہے ۔

مصحفی نے اصلاحِ زبان کی طرف بھی توجہ کی بہت سے ثقیل اور ناہموار الفاظ کو نکال ڈالا ، زبان کو لطیف تر اور پاکیزہ تر بنانے کی کوشش کی، مقامی اور ملکی الفاظ بھی رائج کیے ۔ اور ملکی خصوصیتوں سے مضمون آفرینی بھی کی ۔ قواعد نظم کی انھوں نے سختی سے پابندی کی ۔ شتر گربہ کے عیب سے جو میر و سودا ایسے استادوں کے یہاں بھی پایا جاتا ہے ان کا کلام پاک ہے ۔

مصحفی کی تصانیف میں فارسی دیوان اور اردو کی مثنوی "بحر المحبت" کے علاوہ

اردو کے آٹھ دیوان، ایک تذکرہ فارسی شعرا کا اور ایک تذکرہ اُردو شاعروں کا ہے دیوان میں ہزارہا غزلیں، قطعے، قصائد وغیرہ سب کچھ موجود مصحفی کی شاعرانہ حیثیت اور مرتبہ فن کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے۔ کہ ان کی کثیر تعداد تلامذہ میں آتش۔ میر خلیق، ضمیر، اور امیر جیسے اساتذہ فن بھی شامل نظر آتے ہیں۔

## شیخ قلندر جرأت (متوفی ۱۸۱۰ء)

جرأت دہلی کے رہنے والے تھے۔ اُن کے والد حافظ امان دربار شاہی میں دربانی کی خدمت رکھتے تھے۔ اور لوگوں کی طرح جرأت کا کنبہ بھی دہلی چھوڑ فیض آباد آبسا۔ یہیں جرأت کی تعلیم وتربیت ہوئی۔ بہت کم سنی میں آنکھوں سے معذور ہو گئے طبیعت میں ابتدا سے چلبلا پن اور نشاط پسندی تھی۔ موسیقی سے دلچسپی ہوئی اور شعر و شاعری سے لگاؤ پیدا ہو گیا۔ بڑے خوش مزاج یار باش زندہ دل آدمی تھے بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں اچھی شہرت تھی۔ لکھنؤ اس زمانے میں آئے جب انشاء اور مصحفی کے معرکوں نے عامیانہ لطف و نشاط کا ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ انشاء سے دوستی کے تعلقات قائم ہوئے سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی ہو گئی۔ دربار کے عیش پرور ماحول میں ان کی طبیعت نے خوب رنگ دکھائے۔

جرأت کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ، رباعیاں، مخمس، مستزاد، واسوخت ہجویں اور تاریخیں بھی ہیں۔ جس سے اُن کی مشاقی فن کا بخوبی اندازہ فن ہو جاتا، ان کی زبان بہت صاف اور شگفتہ ہے۔ اور کلام میں ایسی سادگی اور مزہ ہے جو عام لوگوں کو بہت مرغوب ہے۔ جرأت نے رندانہ لذت طلبی، ہوس رانی اور سفلی خواہشات کی بڑے رچاؤ اور رسیلے پن کے ساتھ ترجمانی کی ہے۔ معاملہ بندی ان کی غزل گوئی کا سب سے نمایاں وصف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جرأت کے یہاں

ایک تعیش پرست ماحول کی بہت سچی اور جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ان کی طلب داد پر میر تقی میر کا یہ فرما دینا، "تم شعر کہنا کیا جانو اپنے چوما چاٹی کیا کرو۔ ان کے رنگ مزاج اور رنگ سخن دونوں کا آئینہ کر دیتا ہے۔

جرأت کے رنگ سخن کو اچھی عوامی مقبولیت حاصل ہوئی اور اسی مقبولیت نے ان کا انفرادی امتیاز قایم کر دیا۔

# خواجہ میر اثر دہلوی

سید محمد میر نام، اثر تخلص تھا۔ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے۔ پرورش و تربیت و تصوف درد حاینت کے ستھرے اور پاکیزہ ماحول میں ہوئی تعلیم نے فطری ذہانت کو چار چاند لگا دیئے۔ تصوف، موسیقی، حساب اور دیگر فنون ریاضیہ میں وہ کمال پیدا کر لیا کہ ان کا جواب نہ تھا۔ بڑے بھائی کے گرویدہ تھے انھیں کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ اُن کی رحلت کے بعد اثر آبائی سجادہ پر بیٹھے۔ بے لوث خدا پرستی۔ استغنا، صبر و توکل میں اپنے بزرگوں کی طرح امتیاز حاصل کر لیا۔

اثر شاعری میں بھی اپنے بڑے بھائی خواجہ میر درد کے نقش قدم پر چلتے تھے کلام میں سادگی، صفائی، نفاست، اور پاکیزگی ہے۔ حسنِ حقیقت کی جلوہ آرائی ہے۔ گداز دل اور عاشقانہ گمشدگی ہے۔ وارداتِ دل کا اس طرح بیان ہے جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو۔ زبان عام طور پر نرم شیریں اور لطیف ہے کہیں کہیں الفاظ بھی مل جاتے ہیں۔

دیوان کے علاوہ ایک مثنوی "خواب و خیال" بھی اُن کے قلم سے نکلی مثنوی عاشقانہ ہے اور شعوری تاثر کی حامل ہے۔ اثر کے چند منتخب

اشعار درج ہیں۔

دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا　　دشمنی پر تو پیار آتا ہے۔
کبھی دوستی کے ہے کبھی دشمنی　　تری کون سی بات پر جائیے
یاں تغافل میں اپنا کام ہوا　　تیرے نزدیک یہ جفا ہی نہیں
چھپ چھپ دیکھنے کے مزے سب ہیں اے اثر　　معلوم ہوں گے جو کبھی اُس نے نگاہ کی

میر و سودا، مصحفی اور انشار کے دور میں شمالی ہند اردو شعر گوئی کی زمزمہ سنجیوں سے معمور ہو گیا تھا۔ غرض دہلی کے سواد حسرت میں بھی اُسی کے جان لیوا گیت تھے۔ اور شام اودھ کی عیش پرور فضاؤں میں بھی اُسی کے ترانے ہائے نشاط و مسرت۔ یہ ادب کے دو بڑے مرکز تھے۔ یوں تو جہاں دیکھیے اردو کا بول بالا تھا۔ تذکرہ نگاروں نے شعرا کی اتنی طویل فہرست دی ہے کہ اس اجمالی تاریخ میں سب کے نام گنانا بھی مشکل ہے۔ خاص شہرت حاصل کرلینے والوں میں منت۔ ممنون۔ حسرت دہلوی۔ قدرت۔ بیدار۔ حزیں۔ ہدایت۔ ضیا۔ بقا۔ بیان اور راسخ عظیم آبادی امتیاز رکھتے ہیں۔ اس دور کے شاعروں میں مرزا سعادت یار خاں رنگین نے ایک خاص حیثیت سے بڑی نمود حاصل کی۔ رنگین کی جدت پسندی نے ریختہ سے ریختی بنائی۔ رنگین اور اُن کے دوست انشا نے دربار اودھ کے نشاط پرور ماحول میں اس فن کو ایک مقبول و مرغوب وسیلۂ تفریح بنا دیا۔ عورت کی زبان میں شعر گوئی فی نفسہ کوئی بُری چیز نہیں ہے۔ ہندی کی اعلیٰ ترین شاعری کی لے یہی ہے۔ ہندی کے تتبع میں دکن کے بعض شاعروں نے بھی عورت کی زبان سے شعر کہے۔ شمالی ہند نے غضب یہ کیا کہ لطف مجلس اور طبیعت کی رنگ داری کے لیے یہ فن برتا۔ اس سے شعر و ادب کے مزاج پر جو ناخوش گوار اثر پڑا وہ ظاہر ہے۔

# نظیر اکبر آبادی

(سنہ ۱۷۴۰ء تا ۱۸۳۰ء)

نظیر اکبر آبادی کی شاعری اپنی ایک علیحدہ دنیا رکھتی ہے۔ نظیر نے میر و سودا کی بہار شعر و سخن بھی دیکھی۔ اور دبستان لکھنؤ کی جوانی کا نکھار بھی لیکن ان کی آزاد منشی اور منفرد رنگ طبیعت نے انھیں کسی مسلک کا پیرو اور کسی دبستان کا پابند نہ ہونے دیا۔ بڑے مرکزوں سے دور رہ کر اور رنگ زمانہ سے بے نیاز ہو کر انھوں نے ایک آزاد فضا میں ساز شعر چھیڑا۔ اپنے طرز پر اپنا رنگ سخن نکھارا اپنی شاعری کی علیحدہ روایات بنائیں۔ اردو شاعری میں ان کا رنگ بالکل نرالا ہے

نظیر کا نام ولی محمد تھا۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ والدین کے بڑے چہیتے بیٹے تھے۔ پرورش بڑے لاڈ و پیار سے ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت نظیر نے دہلی چھوڑ دی۔ اور آگرہ آکر محلہ تاج گنج میں مقیم ہو گئے۔ چند دنوں کے لئے معلمی کی ملازمت پر متھرا آ گئے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد آگرہ واپس آ گئے اور یہیں ساری زندگی گذار دی۔ طبیعت میں غضب کا استغنا تھا۔ معلمی کی تنخواہ پر گذر اوقات کی کسی دربار سے وابستہ نہ ہوئے۔

نظیر عربی و فارسی کے بڑے عالم تھے۔ نہ رموز فن کے کوئی بڑے ماہر۔ آزاد منش۔ تعصب اور تنگ نظری سے بالکل پاک، طبیعت دار، من کی موج میں ڈوبے ہوئے تھے۔ باہمہ قسم کے انسان تھے۔ زندگی کو انھوں نے خلوص و جذبہ کے ساتھ برتا۔ اور اس کی ہزار رنگ کیفیتوں، اور مناظر کو دل و دماغ کی چشم بیدار سے دیکھا۔ انھیں کسی مذہب سے کوئی سروکار اور کسی ملت

سے کوئی عناد نہیں تھا۔ وہ عوام کے آدمی تھے۔ عوامی رنگ رلیوں چہل پہل تفریح اور طرب و مسرت کی تقریبوں میں شوق و ذوق سے شریک، غم و ماتم میں اُن کے غمگسار، رفیق سب کے، مذہبی رہنماؤں کا اُن کے دل میں یکساں احترام ہے۔ سب کے تیوہاروں سے اُنھیں یکساں دلچسپی، جوانی نے اُنھیں کوچۂ محبوب میں پھرایا۔ خواہشات کے ہنگاموں اور طلب لذت کی بدمستیوں سے آشنا کیا۔ مایا کی دھوپ چھاؤں جیسی فطرت کے تجربہ کار اور پیروں کی نگاہ متانت نے ان کا رنگ طبیعت بدل ڈالا۔ نظیر کے خیالات اور جذبات کی دنیا عوامی زندگی کی ہماہمی اور مشاہدوں اور تجربوں کی امتحان گاہ بن گئی۔ وہ "فن" کا علمبردار نہیں۔ ذوق طبیعت کا پرستار ہے۔ نگاہوں نے جو دیکھا دل پر بیتی سینے میں جو لہر اُٹھی، اُسے انتہائی فطری، بے تکلف، بے ساختہ انداز میں قالب شعر دیدیا تھا۔ یہ تھا نظیر کا فن شعر گوئی اس کا خطاب براہ راست عوام سے تھا۔ خوشنوایانِ چمن کی بزم طرب اور شاہی ایوان کے نشاط پرور ماحول سے اُسے کوئی سروکار نہ تھا۔ نظیر نہ کسی معیار کا پابند تھا۔ نہ کسی دبستان شعر کا پیرو، نہ کسی استاد وقت کا متبع کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اُس کے یہاں زبان کی غلطیاں اور فن کی لغزشیں ملتی ہیں۔ نظیر معیار پرست اور ذوق فارسی میں ڈھلے ہوئے دور شاعری سے بے نیاز اور بلند رہے اور اس کی آئندہ مقبولیت اور جاوداں شہرت کی ضامن ہو گئی۔ رنگ طبیعت کا تقاضا تھا کہ نظیر نئی راہوں پر گامزن ہو گئے۔ انھوں نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا بیشتر کلام نظموں میں ہے۔ نظمیں مختصر بھی ہیں۔ طویل بھی۔ اُن کے موضوعات میں حیرت انگیز تنوع ہے۔ نظیر کے کلیات میں ایسی نظمیں بھی ہیں جو بچوں کے لئے ہیں۔ یہ عام طور پر بہت سیدھی۔ اور صاف ہیں۔ لیکن کہیں کہیں اُن کے

بھی روحانی تعلیم رمز و استعارہ کے پیرایہ میں دیگئی ہے۔ جو بہت دلکش ہے
نظموں کی خاصی تعداد مذہبی رہنماؤں، تیوہاروں اور ملکی تقریبوں سے متعلق ہیں
یہ نظمیں نظیر کی فراخ مشربی، بے تعصبی اور ہمہ گیر ذوقِ عقیدت کا آئینہ ہیں۔ جوانی
کے رندانہ جوش و مستی کے کلام میں ابتذال و عامیانہ پن کے رنگ بہت تیز ہو گئے ہیں
مشاہدہ اور تجربے کی لذتیں جوش طبیعت میں پیکر شعر میں ڈھل گئی ہیں۔ اس
عیب سے قطع نظر ان نظموں میں جوش و رنگینیٔ بیان اور جولانیٔ فکر کی خوب
خوب جلوہ آرائی ہے۔ نظیر کی شاعری کا بہترین حصہ وہ ہے۔ جس میں
انھوں نے ایک صوفی، صافی مردِ باخدا کی حیثیت میں دنیا اور زندگی کے بے
ثباتی کا عبرت انگیز مرقع کھینچا ہے۔ انجام عیش کی تلخیوں کی موثر مصوری کی
ہے۔ اخلاقی اوصاف کی تلقین کی ہے۔ اور پاکبازی اور روحانیت کا پیام دیا
ہے۔ اس کلام میں اس قدر تاثیر ہے۔ خلوص اور روحانی سرشاری کا سامان
ہے۔ کہ نظیر کی شاعرانہ حیثیت اور ادبی عظمت بہت بلند ہو جاتی ہے۔ اور وہ
شیخ سعدی کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں؛

# دور آتش و ناسخ

**ناسخ** ——— متوفی ۱۸۳۸ء زبان و ادب کی تاریخ میں ناسخ کی حیثیت
بہت اہم اور ممتاز ہے۔ وہ دبستان لکھنؤ کے حقیقی بانی تھے۔ شاہ حاتم کے
دور سے شمالی ہند میں اصلاح زبان کے جس عمل کا آغاز ہوا تھا۔ ناسخ نے اسے
مکمل کر دیا۔ ان کی زبردست اصلاحات اور کوششوں نے زبان کا وہ معیار
قائم کر دیا جو تاریخ میں لکھنؤ کا طرہ امتیاز ہو گیا۔

شیخ امام بخش ناسخ فیض

قوی جسیم اور تنومند آدمی تھے۔ ورزش کا بے انتہا شوق تھا۔ اور اس میں بڑا ریاض کرتے تھے۔ بالکل صحت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعری میں انھوں نے کس کس کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا تھا۔ ناسخ نے فطری شوق شعر گوئی کو بڑی مستعدی سے، جانفشانی اور مشق و ریاض سے چمکایا اور یہ امتیاز کمال حاصل کر لیا کہ ان کی استادانہ حیثیت بڑے شان و وقار کے ساتھ قایم ہو گئی۔ لکھنو میں اُن کے حریف خواجہ حیدر علی آتش تھے۔ ان استادوں اور اُن کے شاگردوں کی شاعرانہ چشمکیں شعر و ادب کی محفلوں کو گرمائے رہتی تھیں۔ ناسخ بڑے خوددار اور با حوصلہ آدمی تھے۔ اپنے وقار منصب کا شدید احساس رکھتے تھے۔ فرمانروائے وقت اور وزیر سلطنت سے کچھ ناچاقی ہو گئی۔ شہر چھوڑنا پڑا اور برسوں باہر ہی رہنا پڑا۔ آخر عمر میں لکھنو آ گئے تھے۔ یہیں انتقال کیا۔

ناسخ نے اصلاح زبان کی طرف خاص توجہ کی۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے کڑے ضابطے مقرر کیے۔ افعال میں تغیر کیا۔ مثلاً آئے ہے جائے ہے کے بجائے آتا ہے، جاتا ہے۔ اور آئیاں اور کھائیاں وغیرہ ترک کر دیا۔ عربی اور فارسی الفاظ کو املا اور تلفظ کی صحت کے ساتھ برتنے پر زور دیا۔ عربی اور فارسی گرامر کے قاعدے سختی کے ساتھ نافذ کیے۔ اصلاح کے عمل میں انھوں نے ہندی الفاظ اسالیب الفاظ کے ساتھ ہندی کے سبک اور شیریں الفاظ اور ترکیبیں بھی فارسی پرستی کے جوش فراواں میں دائرہ زبان سے خارج کر دیں۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ ادبی زبان زیادہ دنوں سیال حالت میں نہیں رہ سکتی۔ اس کی صحت شائستگی اور وقار کا معیار عمل ارتقا کے فطری اور حقیقی تقاضے کے نتیجہ میں قائم ہوتا ہے ناسخ کے دور تک پہونچتے پہونچتے اردو زبان اس منزل میں قدم رکھ چکی ہے جہاں اسکا واضح، محکم یا ضابطہ ادبی معیار قائم ہونا ضروری ہو گیا تھا۔ یہ اردو کی بدنصیبی

تھی کہ معیار قایم کرنیوالوں نے قطعاً بھلا دیا تھا کہ اردو اپنی اصلی و فطرت میں ایک دوڑھی زبان ہے۔ بھاشا پر فارسی کے تہذیب آفریں عمل سے ظہور میں آئی ہے۔ اس کی صحیح راہ ارتقا دیہ ہے کہ یہ ہر شان اور بہ ہر پہلو اسکی سموئی ہوئی دوڑھی فطرت کا لحاظ رکھا جائے۔

ناسخ نے اپنی اصلاحات پر بڑی شدت سے عمل کیا اور اپنی ترتیب سے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ قایم کر دیا۔ جس نے ناسخ کی اصلاحات کو مزاج ادب بنا دیا۔ ناسخ کے ایک مشہور شاگرد علی اوسط رشک نے اس باب میں خاص امتیاز حاصل کر لیا۔ انھوں نے اپنے استاد کی اصلاحات کو اپنی اردو لغوت "نفس اللغات" میں مدون کر دیا ہے۔

ناسخ اعلیٰ معیار کے ذوقِ شاعرانہ سے بہرہ ور نہیں معلوم ہوتے انکی تمام تر توجہ فن پر رہتی ہے۔ وہ قدرت کلام اس زور، طنطنہ اور شوکت بندی کے ساتھ دکھاتے ہیں۔ کہ جذبہ کی نزاکت اور خیال کی لطافت بنیٹر گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ اور دور از کار تشبیہوں، استعاروں، تمثیلوں اور فارسی اور عربی کے مرعوب کن موٹے موٹے الفاظ کے برتنے کا انھیں بڑا شوق ہے۔ اسلئے انکے کلام میں تکلف اور آورد بہت پایا جاتا ہے۔ ناسخ کی حقیقی اہمیت مصلح زبان کی حیثیت سے ہے۔ ان کا شاعرانہ مرتبہ بلند نہیں ہے۔ ناسخ کے تلامذہ میں وزیر، اشک، برق، بحر، آباد، مہر اور منیر نے بڑی شہرت حاصل کی۔

## خواجہ حیدر علی آتش (متوفی ۱۸۴۶ء)

آتش کی غزل گوئی دبستان لکھنو کا شاندار ادبی کارنامہ ہے۔ خواجہ حیدر علی آتش، ناسخ کے حریف اور اپنے دور کے کامل فن استاد تھے۔ اور صاحب طرز غزل گو تھے

وجہ سے تعلیم سے محروم رہے۔ اور بُری صحبت میں بیٹھ کر مزاج میں شورہ پشتی اور بانکپن آگیا۔ نواب محمد تقی خاں بہادر نے اُن کو ملازم رکھ لیا۔ اور انھیں اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے۔ یہاں کی ساری فضا شعر و ادب کی زمزمہ سنجیوں سے معمور تھی۔ انھیں بھی شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ مصحفی کی شاگردی اختیار کی۔ ماہر فن استاد کی تربیت، اور مشق و ریاضت نے طبیعت کے جوہر کو چمکا دیا۔ ایسا امتیاز حاصل کیا کہ خود صاحب طرز استاد ہو گئے۔ آتش کی علمی استعداد خام تھی۔ مگر بزرگوں کی صحبت اور مصحفی جیسے صاحب فن استاد کی شاگردی نے ادبی سلیقہ مندی سے بھرپور بہرہ اندوز کر دیا تھا۔ آتش بڑے آزاد منش، توکل پسند اور قانع طبیعت تھے پیسے کی خاطر نہ کبھی کسی کی خوشامد کی اور نہ کسی کے سامنے دست سوال پھیلایا۔ غربت و ناداری میں شرافت کی وضع اور طبیعت کی آن بان بڑی شان سے باقی رکھی آتش کی طبیعت میں جو شعر گوئی کی فطری نمود تھی۔ وہ اثر حسن کا بہت لطیف اور نازک احساس رکھتے تھے۔ طبیعت بانکپن اور خیال انگیز کیفیتوں سے بہرہ ور تھی۔ من کی موج میں ڈوبتے تو ذوق روحانی اُبھر آتا تھا۔ غالب کی مفکرانہ شان مومن کی سطح عام سے بلند ہو کر خیال و معنی کے جادو جگانے کا کمال فن میر کی خود رفتگی، خود فراموشی اور درد و گداز نہ سہی۔ آتش کے یہاں تغزل کا لطیف ستھرا اور پاکیزہ معیار ملتا ہے۔ ان کے منتخب اشعار میں جذبہ کی تڑپ اثر آفرینی اور کمال حسن نمائی کا بہت دلنواز ظہور ہے۔ آتش کی زبان بہت صاف، عام فہم اور مؤثر ہے۔ اس میں موتیوں کی سی آب اور چاندی کی سی کیفیت ہے وہ نہ دور دراز تشبیہوں اور استعاروں کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ اور نہ عربی و فارسی کے مغلق الفاظ برتنے کا انھیں چسکا ہے۔ روزمرہ اور عام بول چال کی زبان کو وہ شاعرانہ حسن کاری سے

طلاوت قند سمجھتے ہیں۔ انھوں نے زبان کو سنوارنے اور پاکیزہ بنانے میں بڑی استادانہ مہارت دکھائی ہے۔ وہ فن کے رچاؤ اور زیبائش کا بڑا واضح تصور رکھتے تھے۔ ان کا مشہور قول ہے ؎ شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

ان کے ذوق سلیم اور لطافت فن کے واضح تصور کا آئینہ دار ہے۔ نکتہ چینوں نے آتش کی کم علمی ظاہر کرنے کے لیے بڑے شد و مد سے یہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے عربی و فارسی کے الفاظ عوام کے غلط تلفظ کے ساتھ برت دیے ہیں۔ ناگوار ذوق فروگذاشتوں پر خوب خوب انگشت نمائی کرتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ امر بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اردو کی فطرت ناسخ کی بے لچک ضابطہ پسندی اور مرعوبیت کے ساتھ فارسی نوازی کی بجائے آتش کی عوام پسندی کو زیادہ لائق پذیرائی سمجھتی ہے۔ ماحول کا اثر کہیں آتش کے کلام میں بھی جھلک پڑتا ہے لیکن ان کا عام انداز یہی ہے۔ کہ خیالات ستھرے اور دلکش جذبات رنگین اور خوش بیان صاف شیریں ہے۔ ناسخ و آتش کا مقابلہ ہمارے ناقدروں کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے۔ ذوق نگاہ کا فیصلہ بالکل صاف ہے آتش فطری شاعر تھا ناسخ کی ذہنی زور آزمائی شعریت کے اعلیٰ جوہر سے محروم ہے۔

آتش نے غزل کے علاوہ کسی صنف نظم کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ایک دیوان ان کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا۔ دوسرا دیوان کا تتمہ ہی سمجھنا چاہیئے ان کے مرنے کے بعد ان کے شاگرد میر دوست علی خلیل نے مرتب کیا۔

آتش کے تلامذہ میں رند۔ صبا۔ خلیل۔ نسیم۔ نواب مرزا شوق اور آغا حجو شرف بہت مشہور ہیں۔

~~[illegible]~~

[redacted]

## دبستان لکھنؤ کے دو زندہ جاوید ادبی شاہکار

# گلزار نسیم اور زہر عشق

صنف مثنوی میں سرفہرست میر حسن کی سدا بہار تصنیف "سحر البیان" ہے۔ صاحب "سحر البیان" کے بعد پنڈت دیا شنکر نسیم اور نواب مرزا شوق کی سحر طرازیاں مثنوی کے میدان میں ادبی اعجاز آفرینی کے دو روشن نمونے پیش کر دیتی ہیں۔ نسیم اور شوق دونوں دبستان آتش کے پروردہ تھے، دونوں کی ذہانت، طباعی اور جولانی فکر نمایاں انفرادی شان کے ساتھ ظاہر ہوئی ہے۔ دونوں کا رنگ طبیعت بالکل مختلف تھا۔ اسی لئے ایک ہی میدان میں گامزن ہوتے ہوئے بھی دونوں کی راہیں الگ ہو گئیں۔

نسیم جانِ دادۂ فن تھے۔ وقتِ فکر ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ معنی آفرینی میں اس انداز سے نزاکتیں ہویدا کی ہیں کہ دل دادگانِ ادب جھوم جھوم اٹھیں نسیم کی مثنوی "گلزار نسیم" ادب میں ایجاز و اختصار کی ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ نسیم اس دور کی پیداوار تھے جب آسان کو مشکل بنا دینا کمال فن سمجھا جاتا تھا۔ اس رنگ میں نسیم کی تصنیف لاجواب ہے۔ وقت پسندی کے سبب سے ہمارے زمانے میں اس مثنوی کی مقبولیت میں بہت کمی ہو گئی ہے لیکن سنجیدہ ادبی جائزے میں اس کے وقار اور مرتبہ سے انکار ممکن نہیں ہے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے گلزار نسیم کے متعلق بڑی قیمتی اور قابل غور بات کہی ہے

رشید صاحب فرماتے ہیں "شعر و شاعری کے جن پہلوؤں کے اعتبار سے لکھنؤ بدنام ہے گلزار نسیم نے انھیں پہلوؤں سے لکھنؤ کا نام اونچا کیا ہے۔ میرے نزدیک گلزار نسیم کے بھی سحر البیان ہونے میں شک نہیں زبان کو شاعری اور شاعری کو زبان بنا دینا کوئی معمولی کام نہیں۔ ابھی ہمارے نقادوں کو زندگی اور زبان کے بہت سے بھید بھاؤ سے واقف ہونا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر وہ سمجھیں گے کہ ہماری شاعری کے جانباز وں اور ہماری زبان کے جانکاروں نے کیا کیا کر دکھایا ہے۔

نواب مرزا شوق نے کئی مثنویاں لکھی ہیں۔ لیکن شہرت اور مقبولیت کے اعتبار سے "زہر عشق" کا پلہ سب پر بھاری ہے، عرصہ تک فن کے ناقد مخرب اخلاق کہہ کر اس مثنوی کو ناقابل اعتنا ٹھہراتے رہے۔ لیکن دور جدید نے شعر و ادب کے حسن و فضیلت کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے جو معیار مقرر کیے ہیں۔ ان کی روشنی میں اس مثنوی کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا ہے۔ صاحب زہر عشق نے انسانی دنیا کی ایک دلدوز داستانِ محبت بڑے فطری اور بے ساختہ انداز میں سنائی ہے۔ جذبات کی نفسیاتی مہارت کے ساتھ مصوری کی ہے پیکر آفرینی کے حقیقت پسندانہ تصور کو اجاگر کیا ہے۔ احساس و تاثیر کا "جادو جگایا ہے جو دل کے تار چھو لیتا ہے۔ ہیروئن کی زبان سے شوق نے بے ثباتی دنیا کا جو عبرت انگیز بیان نظم کر دیا ہے۔ وہ شاعرانہ تخیل کا ایک لافانی اعجاز ہے۔ شوق کی زبان کی سادگی و پرکاری بحد حیرت دل کش ہے باتوں باتوں میں کچھ نہ کہتے ہوئے سخن جانستان کہہ جانا یہ ہے شوق کا انداز زہر عشق ناکامی میں محبت جاوداں کامرانی کا سدا بہار افسانہ ہے۔"

# مرثیہ اور مرثیہ گو

دبستانِ لکھنؤ نے شاعرانہ حیثیت سے مرثیہ کو اس قدر ترقی دی کہ وہ اعلیٰ ادب کے مرتبہ پر پہنچ گیا۔ مرثیہ وہ صنفِ نظم ہے جس میں کسی کی موت پر رنج وغم کا اظہار کیا جائے۔ عام طور سے مرثیہ سے مراد وہ نظمیں ہیں۔ جن میں حضرت امام حسین اور ان کی رفقاء کی شہادت کا ذکر کیا جائے۔ ابتداء میں مرثیہ واقعہ کربلا کے غم انگیز بیان، شہداء کے مصائب کے ذکر اور اظہار جذبۂ غم و ماتم تک محدود تھا اس وقت کے ساتھ ساتھ اس دائرے میں حیرت انگیز وسعت پیدا ہو گئی۔ مرثیہ میں شاعری کے کئی رُخ اُبھر آئے اور کئی اصنافِ سخن کی اس کے دامن میں جلوہ آرائی ہو گئی۔ رزم بزم، مناظر قدرت، جذبات نگاری، کرداروں کے نفسیاتی مرقع۔ برگزیدہ اخلاقی اوصاف کی موثر تبلیغ، روحانیت کے اعلیٰ جوہر کا خونِ شہادت میں چمک اٹھنا اور غم انگیز ماحول میں انسانی عظمت کے نقش کا فن کی ضو فشانیوں میں ابھرنا۔ مرثیہ اعلیٰ ترین رزمیہ بھی ہے۔ اور موثر ترین حزنیہ بھی اردو شاعری میں فراوانی موضوعات کے اعتبار سے کوئی صنف مرثیہ سے ٹکر نہیں لے سکتی۔

اردو شاعری روز آغاز سے مرثیہ نگار سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دکنی ادب میں جو اردو کے ادبی ارتقاء میں پہلی منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرثیہ کافی رائج رہا۔ شمالی ہند میں اردو کی شاعری کی عام مقبولیت کے ساتھ ساتھ مرثیہ میں بھی طبع آزمائی کا رنگ تیز ہوتا گیا پہلے مرثیہ کی حیثیت محض مذہبی نظموں کی تھی۔ بتدریج اس میں ادبی شان پیدا ہونے لگی۔ سودا نے مرثیہ میں کچھ جدتیں کیں اس طرح ضمیر نے مرثیہ کے مضمون میں اضافہ کیا۔ اور اس میں جدید تشبیہات و انداز بیان، جنگ کربلا کے مفصل حالات اور شاعرانہ مبالغے داخل کئے۔ فصیح اور دلگیر نے بھی مرثیہ میں

کی صحت اور مضمون کے درد و اثر پر زیادہ توجہ صرف کی۔ ضمیر اور خلیق نے دبیر اور انیس کے ظہور کمالات کے لئے زمین ہموار کر دی۔ مرثیے کے دائرہ میں اب کافی وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی زبان اور انداز بیان کا ایک معیار قائم ہو گیا تھا۔ دبیر اور انیس کی شاعرانہ کاوشوں نے مرثیہ کے دامن کو ادب کے جواہر ریزوں سے معمور کر دیا

## میر انیس (۱۸۰۲ء تا ۱۸۷۴ء)

میر انیس اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جن کے فن سے ادب کی حقیقی عظمت و اثر کا اندازہ ہوتا ہے۔

میر ببر علی انیس فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بعد میں ان کا پورا خاندان لکھنؤ منتقل ہو آیا۔ اور یہیں مستقل سکونت ہو گئی۔ انیس نے علم کے حصول کے علاوہ سپہ گری اور شہسواری میں بھی اچھی واقفیت حاصل کی۔ ورزش کا انھیں بڑا شوق تھا۔ شاعری ان کے گھر کی میراث تھی۔ اور ان کے گھرانے کی زبان اردوئے معلیٰ کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی۔ انیس کے اجداد شعر و ادب کے میدان میں بڑی شاندار روایت قائم کر چکے تھے۔ ان کے دادا میر حسن مثنوی کے میدان میں سدا بہار جادو جگا چکے تھے۔ ان کے والد میر مستحسن خلیق نے مرثیہ میں ایک مؤثر اور فطری انداز پیدا کر کے اپنی ایک باوقار حیثیت بنالی تھی۔ انیس نے میدان مرثیہ گوئی میں اس حیات آفریں انداز میں سے قدم رکھا۔ کہ مولانا حالی کے الفاظ میں اردو شاعری میں جو مار ماراکد کی طرح مدت سے بے حس و حرکت پڑی تھی۔ تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا۔

میر انیس نے ساری عمر مرثیہ کے لئے وقف کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے لگ بھگ ڈھائی لاکھ شعر کہے۔ جو کلام شائع ہو چکا ہے وہ بھی اتنا زیادہ ہے

کہ مرثیہ گوئی کی ایسی زبردست مثال بآسانی نہیں ملتی۔ کلام میں مرثیوں کے علاوہ سلام قطعات اور رباعیاں بھی ہیں۔ کلام انیس کا ایک حمثانہ وصف یہ ہے کہ وہ فنکورانہ مشاقی کی سطح کہیں گرنے نہیں پاتا۔ اور اس میں اول تا آخر ایک حساس، متین باوقار اور اعلیٰ تخلیقی طبیعت کی کارفرمائی ہے۔ انیس کے مرثیے ہمہ جہتی تنقید کے لئے ایک ضخیم دفتر کے طالب ہیں۔ مناظر قدرت کا بیان، انسانی جذبات کی مصوری، پیکر آفرینی، رزم آرائی، بچوں کی نفسیات، جوانی کا تہوار، بڑھاپے کا وقار و متانت، ارباب شر کی مفسدہ پردازیاں، مرثیہ حسین کی ملکوتی شان تخیئل انیس کا جرأت انگیز کمال ہے۔ کہ ہر موضوع پر اعلیٰ درجہ کی نفسیاتی اور فنی مہارت اور فطری شاعرانہ زور و حسن آفرینی کے ساتھ مضامین کے دریا بہائے ہیں۔ میدان جنگ کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔ کہ گویا ایک منظر رزم ہے۔ کہ نگاہوں کے سامنے آگیا ہے پیکر آفرینی میں اس شانِ کمال کے ساتھ اوصاف کو اجاگر کرتے ہیں۔ کہ ڈرامائی شان ہو یدا ہو جاتی ہے۔ ذہن کا ایک ماحول بنتا ہے۔ فن کا اعجاز ہمیں اس اپنی دنیا سے دور انیس کی نگارخانہ شعری میں لے جاتا ہے۔ جہاں تاریخ اپنا ایک پچھلا ورق الٹتی ہے۔ خیر و شر کے تصورات پیکروں کے روپ میں اُبھرتے ہیں۔ گردشِ روز و شب کے دامن میں ایک نرالے انداز کی جنگ ہوتی ہے، ایک طرف سینکڑوں کا لشکر۔ دوسری طرف کل بہتر بہتر۔ بھلا مقابلہ کیا۔ لیکن موت کا ایک انداز یہ بھی ہے، کہ زندگی کے چہرے پر جاوداں رونقیں بکھر جاتی ہیں۔ انھیں رونقوں نے انیس کے فن کو لازوال فضیلت بخشدی۔ مرثیہ کے موضوع میں عظمت ہے۔ انیس کی شاعری نے اس موضوع کی عظمت، اعلیٰ مصورانہ کمال کے ساتھ نمایاں کردی اس کی شاعری بھی مرتبہ عظمت پر پہنچ گئی۔

انیس نے اپنے دور اور اپنے ماحول کی شاعری سے اپنے آپکو بلند رکھا اور

تصنع اور تکلف، اور مبالغہ کو برتتے ہوئے بھی اپنی شاعری کو حقیقی جذبات کا شفاف آئینہ بنا دیا۔ انیس نے زبان کے دائرہ کو بے انتہا وسیع کر دیا۔ نہ معلوم کتنے پرانے محاورات اور الفاظ نیا معنوی نکھار پا گئے۔ بڑی تعداد میں نئے الفاظ محاورات، ضرب الامثال اور آرائشِ بیان کے زیور داخل زبان و ادب ہو گئے۔ انیس نے عام فہم اور سادہ زبان برت کر حقیقی فطری شاعری کا ایک بہت بلند معیار قایم کر دیا۔ اور اپنے تخیلات سے اردو شاعری کی تہی مائیگی کو بہت حد تک دور کر دیا۔

# مرزا سلامت علی دبیر

(۱۸۰۳ء تا ۱۸۷۵ء)

مرثیہ نگاری میں انیس و دبیر کا نام ساتھ ساتھ آتا ہے۔ سودا و میر، مصحفی و انشا اور ناسخ و آتش کی طرح یہ دونوں بھی ایک دوسرے کے حریف و ہم چشم تھے دبیر مرثیہ کے صاحب فن اور بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ انھیں زورِ بیان پر قیامت کی قدرت حاصل تھی۔ دبیر نے اپنے تخیل سے مرثیہ کو خوب خوب نکھارا۔ اور اسلوبِ خیال کی جدت طرازیوں سے اس میں خوب خوب آرائش پیدا کیں۔ انیس کی طرح دبیر نے بھی مرثیہ کو بڑی وسعتوں کے ساتھ برتا ہے۔ اور کمال فن کا خوب خوب اظہار کیا ہے۔ دبیر فن کے دلدادہ تھے۔ وہ کلام کی آرائش بیان کے شکوہ و شان اور ذہن کی پرواز و رسائی پر زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ جذبہ کی نزاکتوں اور موقع کی لطافتوں کی شاعرانہ مصوری میں نگاہ، نفسیاتی مہارت اور زندگی کے رمز و روح میں خیال و فکر کی بصیرت زیادہ اثر آفریں اور خیال انگیز ہوتی ہیں۔ ایک مخصوص دور کے فن کی دی ہوئی عظمت زمانہ کے ساتھ ماند پڑ جاتی ہے۔ لیکن جہاں زندگی بہ شانِ زندگی نمایاں ہو جاتی ہے وہاں ادب زبانوں

کے ساتھ مخصوص نہیں رہتا۔ بلکہ اس کے اثر میں وقتی شان پیدا ہو جاتی ہے زندگی کے رمز و روح میں ڈوب کر دنیا کے بڑے شاعروں نے اپنی دوامی عظمت کے چراغ روشن کئے ہیں۔ فن کی آرائشوں اور ایک خاص زمانہ میں مقبولیت حاصل کر لینے والی ادب کی قدروں پر تمام تر زور اور صرفِ توجہ کرنے والے ادیب و شاعر، اپنے زمانہ میں چاند سورج بن کر چمک گئے۔ لیکن اُس کے بعد ان کی عظمت و مقبولیت میں کمی آتی ہو گی۔ دبیر کے دور میں ظاہری آرائش و زیبائش، زور و شکوہ اور قوت پرواز فکر دکھانے کا شوق عام تھا۔ یہی زمانے کا موج اور بیشتر ادیبوں کی تمنا کا یہی نقطۂ انتہا تھا۔ دبیر نے اس حیثیت سے خوب خوب کمال آفرینی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ بہر انداز قوت نظم کی سحر آفرینیاں دکھائیں۔ انیس اپنے دور کے مزاج کا حدِ جائز میں پاس و لحاظ کرتے ہوئے اپنے دور کے وقتی تقاضوں سے بلند ہو گیا۔ اس نے زورِ ذہن اور قوتِ فکر دکھانے سے زیادہ زندگی کی مصوری کی، افراد کے جوہر سیرت کو شاعرانہ نکتہ نوازی کے ساتھ نمایاں کیا۔ فطرت کے جمال باطن کو شعری پیکروں میں جھلکایا۔ انیس و دبیر اپنے دور میں حریف رہے۔ لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ انیس کا مرتبہ بلند ہوتا گیا دورِ جدید کے سنجیدہ اور منصف مزاج ناقدروں نے تسلیم کر لیا ہے۔ کہ انیس کا وقار فن اردو کے باقی رہنے والے ادبی کمالات میں ہے۔

انیس و دبیر کے بعد بھی لکھنؤ میں مرثیہ گوئی مقبول رہی۔ آج تک لکھنؤ میں مرثیہ گوئی کا رواج ہے۔ لیکن انیس، دبیر اور بالخصوص انیس نے مرثیہ کو جس منزل ترقی تک پہنچا دیا وہاں تک رسائی بس سے باہر معلوم ہوتی ہے۔

# دورِ ذوق و غالب

## دبستانِ دہلی

**شاہ نصیر — متوفی ۱۸۳۸ء** شاہ نصیر دہلی کے رہنے والے اور شاہ عالم کے درباری شاعر تھے۔ اپنے زمانے کے مشہور استادوں میں تھے۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق جیسے باکمالِ عصر نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مومن نے ابتدا میں انھیں سے اصلاح لی۔ بڑے شگفتہ مزاج اور بذلہ سنج تھے۔ کئی سفر حیدرآباد کے اور دو سفر لکھنؤ کے کئے۔ پورے ملک میں ان کے فن کی اچھی قدر دانی ہوئی۔ شاہ نصیر کا اندازِ سخن ناسخ سے بہت ملتا جلتا ہے۔ وہ شکوہ الفاظ کے عاشق تھے تشبیہوں اور استعاروں کی تلاش میں بڑی کاوش کرتے تھے سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف و قافیہ میں خیالات نظم کرنے کی انھیں اچھی مشق تھی۔ ان کے کلام میں اعلیٰ خیالات جذبہ کی تڑپ اور فکر کی تابش عنقا ہے۔ ان کی شاعری بالکل رسمی اور اس دور کی مروجہ فن پرستی کی سختی سے پابند ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے نام و کلام کی اہمیت کم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ وہ بھی اسی قسم کے فنکاروں میں تھے جو صرف اپنے دور کے لئے ہوتے ہیں۔

## حکیم مومن خاں مومن

(۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۱ء)

اردو غزل کو سنوارنے اور سدا بہار نکھار بخشنے والوں میں مومن دہلوی کو امتیاز حاصل ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ مومن کے فن نے صنفِ غزل کی لطافت

جذبہ انگیزی اور اثر آفرینی کو اعلیٰ مہارتِ فن اور شاندار انفرادی روایات کیساتھ نمایاں کیا ہے۔

(۲) مومن حیرت انگیز ذہانت کے انسان تھے۔ طبیعت میں قیامت کی اُپج اور حافظہ اتنا زبردست تھا کہ جو بات سنتے فوراً یاد ہو جاتی تھی (۳) عربی اور فارسی میں اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے تھے۔ فن طب خاندانی میراث تھی۔ نجوم میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ ان کی پیشین گوئیاں سن کر بڑے بڑے ماہرین نجوم حیران رہ جاتے تھے۔ شطرنج میں بھی استادانہ مہارت حاصل کرلی تھی (۴) بڑے خوبرو خوش وضع اور خوش پوشاک تھے (۶) طبیعت میں بڑی نفاست اور مزاج میں بڑی مستی اور رنگینی تھی۔ عاشقانہ مزاج اور دہلی کے گلی کوچے، تمنا کے خاکے میں خوب خوب رنگ اُبھرے۔ مستیوں کا جوبن خوب خوب نکھرا۔ نگاہ کی لگاوٹ نے خوب خوب بہار آفرینی کی جوانی کے ساتھ کا دور بھی ختم ہو گیا۔ اور دینداری کا شوق بڑے شد و مد سے اُبھر آیا۔ یوں عقائد میں وہ ابتدا ہی سے بڑے پختہ موحد تھے۔ جوانی ہی میں سید احمد شہید کے مرید ہو گئے تھے اور تا دمِ مرگ یہ عقیدت باقی رہی بلکہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس میں عملی پختگی آتی گئی (۵) بڑے خوددار قانع طبیعت اور انانیت پسند انسان تھے۔ امیروں اور رئیسوں کی خوشامد اور درباداری سے اُنھیں سخت نفرت تھی۔ اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا اُنھیں اس درجہ پاس و لحاظ تھا کہ بڑے سے بڑے باکمال کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

(۶) مومن کی طبیعت میں شعر گوئی کا فطری جوہر تھا۔ عاشقانہ مزاج نے اس جوہر کو خوب چمکایا۔ اس رنگ کو خوب نکھارا۔ مومن کے دور کی دہلی علم و کمال کے رنگ پر آئی ہوئی محفل تھی۔ دم توڑنے سے پہلے غم لضبط دہلی کا آخری

سنبھالا تھا۔ غالب، ذوق، آزردہ اور صہبائی جیسے باکمالوں کے ہاتھوں علم و ادب کا نصیبہ جاگ اٹھا تھا۔ ظہور کمال کے لئے فضا، بہر انداز ساز گار تھی۔ مومن کے امتیاز فن نے اس بزم علم و کمال میں آسمان سے تارے توڑ کر بکھیر دیئے شعر گوئی کے ابتدائی دور میں انھوں نے شاہ نصیر سے اصلاح لی لیکن یہ سلسلہ چند روزہ تھا۔ خداداد استعداد نے مومن کی رہبری کی۔ مشق و ریاض نے راہ کمال طے کرائی اور فکر کی دلیرانہ یلغار نے مومن کو نامورانِ ادب کی گود میں پہنچا دیا۔

مومن کے ذوق اختراع بڑی انفرادیت کے ساتھ کمال آفرینی کی ہے تاریخ گوئی میں انھوں نے ذہانت اور مشاقی فن کو عجیب عجیب انداز سے ہویدا کیا ہے۔ ان کے دیوان میں چھ مثنویاں اور مختلف اصناف کا کلام موجود ہے اس سے ان کی قوت شعری گوئی اور قادرالکلامی کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ مومن کا حقیقی امتیاز کمال ان کا طرز غزل گوئی ہے۔ جس نے بڑے اعلیٰ معیار کی شعری روایات قایم کر دی ہے۔ مومن کی فکر بلند، خیال آفریں اور اپنی راہ آپ بنانے والی تھی۔ پامال فرسودہ راہوں سے ان کی طبیعت گریز کرتی ہے۔ ان کی دنیا مستی فکر کی دنیا ہے۔ تجربات محبت کے سینے میں در آجانے والی نگاہ کی دنیا ہے اس شعور و کرب اور کیف باطن کی دنیا ہے۔ جو زندہ جاندار اور توانا محبت کے فیضان سے سرمایۂ فکر و خیال بن جاتی ہے۔ دل کی گہرائیوں سے ابھر کر فکر توانا کی اوج سے روشنی، شعار اور رنگ جلال حاصل کر لینے والی پر وقار شورش سری مومن کی جذبات نگاری میں کمال شعریت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ فارسی کے رچے ہوئے مذاق اور اعلیٰ شوق ایجاد نے ان کے تخیل کو سطح عام سے بلند کر کے نازک خیالی اور مضمون آفرینی کا گہوارہ بنا دیا ہے۔ میں نے اپنے ایک مضمون میں کلام مومن پر اظہار خیال کی جرأت کرتے ہوئے لکھا تھا۔

۹ "مومن کے خیالات وجذبات کی دنیا عام راہوں سے الگ اور بہت بلند ہے اس کے یہاں فکر و جذبے کی ایک نرالی شان ہے۔ ایک خاص قسم کی محویت ہے۔ درد کی کسک بھی ہے۔ اور دل کی تڑپ بھی۔ لیکن ایک بلند انداز لئے ہوئے مومن کے خیال نے رنگینیوں کی ایک دنیا بنائی ہے۔ جہاں وہ کھو جاتی ہے مومن کے فکر غزل گوئی کے عام معیار سے اس قدر الگ ہے کہ بہت دلوں تک ان کے کلام کے ساتھ صحیح انصاف نہیں کیا گیا۔ لیکن اب ہم اس کے فن کی حقیقی عظمت اور اہمیت سے باخبر ہونے جا رہے ہیں۔"

مومن کے مشہور تلامذہ میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مصنف "گلشن بے خار" اور نسیم دہلوی خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

# ذوق دہلوی (متوفی ۱۸۵۴ء)

(۱) دبستان دہلی میں ذوق کے نام کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ محمد ابراہیم نام اور ذوق تخلص تھا۔ ایک غریب سپاہی محمد رمضان کے لڑکے تھے۔ شعر و شاعری کا ذوق بچپن میں نمایاں ہو گیا تھا پہلے اپنے معلم حافظ غلام رسول کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اس زمانے میں شاہ نصیر دہلوی کا طوطی بول رہا تھا۔ ذوق بھی ان کے شاگرد ہو گئے۔ شوق طبیعت نے حصول فن کے لئے بڑی گرم جوشی
(۲) اور مستعدی پیدا کی۔ دل لگا کر محنت کی ان کی شاعرانہ مقبولیت روز بروز بڑھنے لگی بہت جلد علمی و ادبی حلقوں میں ان کا وقار اتنا بلند ہو گیا کہ قلعہ معلیٰ تک رسائی ہو گئی اور خود ولی عہد سلطنت ظفر دہلوی۔ ان سے اصلاح لینے لگے۔ دربار میں آخر دم تک ان کا بڑا اعزاز رہا۔ خاقانی ہند کا خطاب ملا۔ ایک

ہاتھی مع ہودہ نقرئی بھی عطا ہوا۔ غدر کے حادثہ عظیم سے تین برس پہلے جہاں فانی سے کوچ کیا۔ دہلی کے ایسے دلدادہ تھے کہ بڑے سے بڑے مالی فائدوں کی توقعات بھی ان سے دہلی نہ چھڑا سکیں۔

(3) ذوق بڑے نیک، پاکباز، بامروت، خلیق اور رحمدل انسان تھے۔ علم وادب سے انھیں فطری شغف تھا۔ فن کے لئے بڑی سے بڑی جانفشانی میں ذہنی لذت محسوس کرتے تھے۔ ذوق محض اپنے جوہر ذاتی اور مشق و ریاض کی بدولت اس مرتبۂ کمال پر پہنچے، ورنہ شاہی امارت کے زمانے میں ایک غریب سپاہی زادہ کی حیثیت کیا ہے۔

ذوق کا بہت سا کلام غدر میں تلف ہو گیا۔ جو کچھ بچ گیا اسے ان کے سعادت مند شاگرد اور اردو کے مایۂ ناز انشاء پرداز محمد حسین آزاد نے بڑی محنت اور اہتمام سے ترتیب دیکر شائع کر دیا۔

(4) ذوق کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فن کی ستھرگی، الفاظ بندش اور سلیقہ مندی کا بڑا واضح اور پختہ تصور رکھتے تھے۔ زبان کو صاف شگفتہ اور شستہ و رفتہ کرنے میں ان کا کمال بہت قابل قدر ہے۔ انھوں نے محاورات ضرب الامثال اور روزمرہ کو بڑی حسن آرائی اور معنی آفرینی کے ساتھ شاعری میں جگہ دی ہے۔ اور اس طرح بڑی خوبی اور سلیقہ مندی کے ساتھ عوامی زبان کو ادبی وقار بخشا ہے۔ ذوق کی کوششوں نے دہلی کی ٹکسالی زبان کا ایک واضح ادبی معیار قائم کر دیا۔ ان کی غزلوں میں زبان کے حسن اور بیان کے لطف نے وقتی ہی لیکن ایک دلکشی پیدا کر دی ہے۔

(5) اخلاقی مضامین انھوں نے کثرت سے نظم کئے ہیں اور ذوق تصوف سے بھی کلام کو سنوارا ہے۔ لیکن غزل کے لئے جس کیف طبیعت سپردگی اور سوز باطن کی ضرورت ہے۔ اس کی ذوق کے

یہاں نمایاں کمی ہے۔ قدرتِ کلام اور لطافتِ زبان کے لئے ان کی داد و تحسین بالکل بجا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کے یہاں وہ شے بہت کم ہے جسے تغزل کہتے ہیں۔

(6) ذوق کا حقیقی میدان قصیدہ گوئی ہے۔ اس صنف میں سودا کے بعد انھیں کا رتبہ ہے۔ قصیدہ میں تخیل کا زور، بیان کے شکوہ، مضمون آفرینی کی بہار، فن کی چابکدستی اور علمیت دکھانے کا خوب موقع ملتا ہے۔ ذوق میں یہ سب خوبیاں اچھے توازن اور تناسب کے ساتھ موجود ہیں۔

قصیدہ نگاری میں انھوں نے خوب کمال دکھایا ہے۔ ذوق کے قصیدوں میں عالمانہ وزن و وقار ہے۔ بیان کی دلآویز آرائشیں ہیں، مضمون آفرینی کے کمالات ہیں، الفاظ کے بہاؤ اور سجاوٹ، ترکیبوں اور چست بندشوں، تشبیہوں اور استعاروں کی تلاش میں خوبیِ نظم کا بہ شانِ ندرت و صنعت ظہور، ذوق کا کلام، آتش کے اس معیارِ سخن پر بہ ہمہ وجوہ پورا اترتا ہے۔ کہ ع

"شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا"

زبان کی سادگی اور شگفتگی اور بیان کی روانی کہیں کہیں کلام میں بڑا خوشگوار ترنم پیدا کر دیتی ہے۔ قصیدہ نگاری میں ذوق و سودا کا مقابلہ بھی ہمارے تنقیدی موضوعات میں ایک دل چسپ موضوع ہے۔ یہ عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ سودا کی حیثیت ذوق سے بلند ہے۔

سودا کو ذوق کی بہ نسبت کہیں زیادہ روحِ فن میں گہری بصیرت حاصل تھی۔ سودا کی فکر میں جو درا کی، تیزی اور گہرائی ہے۔ وہ ذوق کے یہاں نہیں ملتی۔ باعتبار ماہیت فن سودا کو ذوق پر نمایاں فضیلت حاصل ہے۔

ذوق کے شاگردوں میں داغ، ظفر، آزاد، ظہیر اور انور بہت مشہور ہوئے۔

# غالب

اُردو ادب کی تاریخ میں غالب ایک ایسا امتیاز رکھتے ہیں جو بہت کم شاعروں کے حصہ میں آیا ہے۔ وہ پرانے دور کے خاتم اور نئے زمانے کے پیش رو تھے ان کی فکر میں نئی روشنی کی صاف جلوہ گری ہے۔ انھوں نے فن کی مہارت اور ذہن کی اپج کے ساتھ ادب میں انقلاب کے لیے زمین ہموار کی۔ اور اردو شاعری کے چھپے ہوئے امکانات کو ایسے بلیغ انداز میں اجاگر کیا کہ بعد میں آنیوالوں کے سامنے حوصلہ مندی کی راہیں کھل گئیں۔

اسد اللہ خاں نام اور مرزا نوشہ لقب تھا۔ پہلے اسد تخلص کرتے تھے بعد میں غالب۔ ۱۷۹۷ء میں بمقام آگرہ پیدا ہوئے۔ غالب کو اپنے عالی خاندان ہونے پر بڑا ناز تھا۔ ان کا خاندانی سلسلہ ایک ترکمانوں سے ملتا ہے جو اپنے کو افراسیاب اور فریدوں کی نسل سے بتاتے تھے۔ غالب کے دادا ہندوستان آئے اور شاہ عالم کے دربار میں بڑی عزت حاصل کی۔ ان کے والد تلون مزاج آدمی تھے۔ لکھنؤ۔ حیدر آباد، الور، مختلف ریاستوں میں ملازم رہے۔ اور کہیں جم کر نہ ٹھہرے غالب کا سن پانچ برس کا تھا کہ ان کے والد لڑائی میں مارے گئے۔ والد کے انتقال کے بعد مرزا کی پرورش اور تربیت کا بار ان کے چچا مرزا نصر اللہ بیگ کے سر پڑا۔ جنہیں خدمات کے صلہ میں انگریزی سرکار سے جاگیر مل گئی تھی۔ غالب نو برس کے تھے کہ ان کے چچا کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ان کی پرورش ننھیال میں ہوتی رہی۔ چچا کے وارثوں کو پنشن ملی غالب کو بھی سات سو روپیہ سالانہ ملتا رہا۔ پنشن ہی کے سلسلہ میں مرزا ۱۸۰۳ء میں کلکتہ بھی گئے تھے۔ راستہ میں لکھنؤ اور بنارس میں بھی قیام کیا۔ ۱۸۴۹ء میں بہادر شاہ ظفر نے پچاس روپے ماہوار خلعت مقرر کر دی

ذوق کے انتقال کے بعد بادشاہ کے کلام پر اصلاح دینے کا کام اُن کے سپرد ہوا یہ سلسلہ زیادہ دنوں نہ چل سکا۔ غدر میں مرزا بھی معتوبین کے زمرے میں آ گئے لیکن بعد میں ان کی بے گناہی ثابت ہو گئی۔ اور سابقہ عزت بھی ملی اور پنشن بھی بحال ہو گئی غالب نواب رامپور کے بھی استاد تھے۔ جو انھیں تادم آخر سو روپیہ مہینہ بطور وظیفہ دیتے رہے۔ ۱۸۶۹ء میں جب اُن کا سن تہتر برس کا تھا انتقال کیا۔

(6) غالب بڑے زندہ دل، شگفتہ مزاج اور با اخلاق تھے۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں کے ساتھ بڑی محبت کرتے تھے۔ رندی اور فراخ مشربی ان کا مسلک تعصب اور مذہبی تنگ نظری کا ان کے پاس گزر نہیں تھا۔ جتنے صاف باطن تھے

(7) اتنے ہی صاف گو بھی تھے۔ اپنی وضع کے بہت پابند اور اصول کے پکے تھے۔ فارسی سے غالب کو دلی مناسبت تھی۔ اُنھوں نے بڑے ریاض سے فارسی زبان و ادب۔ فارسی نظم و نثر دونوں ان کے قلم سے یکساں سیراب ہوئیں۔ ان کی

(8) فارسی نظم گوئی اعلیٰ پایہ کی مہارت اور نثر اکثر فن سے بہرہ ور ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی جاودانی عظمت کا انحصار ان کے اردو دیوان پر ہے۔ غالب نے اردو غزل گوئی کو جذبات و خیالات کے نازک، نفسیاتی اظہار کی اعلیٰ ترین سطح پر

(10) پہنچا دیا۔ غالب ایک "ہمہ رنگ" قسم کے آدمی تھے۔ کبھی وہ فلسفی معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں معرج روحانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کہیں رندی و سرمستی کے ترانے الاپتے ہیں۔ اور کہیں باغیانہ تیور کے ساتھ صدیوں کی بنی بنائی روایتوں اور قدروں پر آنکھ کرتے ہیں۔ لیکن ہر حال میں ان کا یہ امتیازی وصف نمایاں رہتا ہے۔ کہ جو چیز بھی ان کے قلم سے نکلی ہے گہری فکر کی آنچ میں تپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ دنیا کو انھوں نے ہوشمندی کی نگاہ سے دیکھا بھی اور جذبہ کی گرمی کے ساتھ برتاؤ ہے۔ ان کے بالغ اور رچے ہوئے مذاق نے تجربوں اور مشاہدوں

(11) مطالعہ جاری ہے

کو یہاں احساسات کے ساتھ اس حسن کاری اور تخئیل کی رعنائی کے ساتھ سمویا ہے کہ ان میں بلا کی وسعت اور باعتبار اثر غضب کی گہرائی پیدا ہو گئی ہے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی فکر انسانی نفسیات کے لطیف نکات میں کہ ظاہر ہوتے ہیں پیچ وخم پر بڑی گہری تھی۔ اسی لئے ان کے یہاں محبت کے تجربے نفسیات کے۔ غالب کی فکر میں ایک شوخی ہے۔ یہ شوخی محض بیان تک محدود نہیں ہے خیالات وجذبات بھی اس کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ عام راہوں سے ہٹ کر چلنا اور نگاہ کی عام گزرگاہوں سے بچ کر بالکل نئے رخ سے دیکھنا غالب کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تجربات بالکل نادر نظر آتے ہیں۔ اور ان تجربات کے بیان کے لئے جو الفاظ ترکیبیں اور بیان کے اسلوب انھوں نے تراشے ہیں وہ خالص ان کے ذہن کی پیداوار ہیں۔ غالب اقبال کی طرح فلسفی نہیں تھے۔ یہ نگاہ کی ندرت اور گہرائی ہے۔ جس نے اُن کے کلام کو فلسفیانہ شان دیدی ہے۔ غزل اپنی فطرت اور ساخت کے اعتبار سے تفصیلی اور طویل خیالات کو پیش کرنے سے معذور ہے۔ اس کا ہر شعر کسی مختصر بات یا کسی بڑی بات کے ایک پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔ اپنے اصلی اور اعلیٰ معیار پر پہونچ کر غزل خیالات اور جذبات کے جوہر نچوڑ کر اظہار کا موثر ترین ذریعہ بن جاتی ہے غزل کو حقیقی معنی میں صرف وہی شاعر برت سکتے ہیں جو وسیع تجربات کو کھاد کر موثر لطیف نکتے پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ غالب کے کلام نے غزل کے جوہر پسند وصف اور ہمہ گیر اثر پذیری کو بڑے نازک فلسفیانہ انداز سے نمایاں کیا ہے۔ اسی نکتہ میں غالب کی حقیقت عظمت کا راز پنہاں ہے اس کے شعر بالکل یکساں انداز میں زندگی کی سادہ سے سادہ اور نازک سے نازک SITUATION پر اس بھرپور انداز میں چسپاں ہوتے ہیں۔ گویا وہ اسی

اسی موقع کے لئے کہے گئے ہیں۔ یہ عمومیت اور اثر کی گہرائی فن کا لافانی اعجاز ہے
غالب نے قصائد بھی کہے ہیں۔ قصائد میں اُن کی طبیعت کا بانکپن اور تخیل
کی جدت و شوخی خوب خوب نمایاں ہے۔ تلاشِ مضمون میں بھی خوب خوب
مظاہرہ کیا ہے۔ کہیں کہیں طبیعت کا فلسفیانہ رنگ بڑے شاندار الفاظ
میں جھلک پڑا ہے۔ لیکن قصیدہ ان کی حقیقی شاعرانہ عظمت کا میدان نہیں ہے

غالب کی ذہانت اور اختراع پسندی نے اردو نثر میں بھی ایک نئی راہ
دکھائی ہے۔ انھوں نے سادہ نگاری کے فن کو ایسے دلکش ادبی انداز میں برتا
کہ وہ نثر میں بھی جدید دور کے پیشرو بن گئے۔ غالب کا فن اردو ادب کے معرکتہ الآراء
فتوحات میں ہے۔

---

۱۸۵۷ء کے بعد دہلی اور لکھنؤ اسکول کی شعری روایتوں کو زندہ رکھنے
والوں میں داغ، امیر، اور جلال نے خاص حیثیت حاصل کرلی۔ ذیل
میں ہم ان تینوں شاعروں کی زندگی کے مختصر حالات اور کلام پر مختصر
تبصرہ درپیش کئے دیتے ہیں۔

# داغ

نواب مرزا خان داغ ۱۸۳۱ء میں دہلی میں پیدا ہوئے چھ سات
برس کے تھے۔ کہ ان کے والد نواب شمس الدین خاں کا انتقال ہوگیا۔ داغ
کی والدہ نے بہادر شاہ کے فرزند مرزا فخرو سے نکاح کرلیا۔ ماں کے ساتھ یہ
بھی لال قلعہ پہونچے جہاں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی۔ قلعہ کی فضا شاعرانہ
زمزمہ سنجیوں سے معمور تھی۔ ماحول کے اثر نے داغ کے جوہر کو چمکایا۔ اُستاد

ذوق کے شاگرد ہوئے۔ اور اُن کے فیضِ محبت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ بہت جلد اس راہ میں چل نکلے اور تھوڑے ہی دنوں کی مشق سے پختہ کار استاد بن گئے۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کے انتقال کے بعد ان کو اپنی ماں کے ساتھ قلعہ چھوڑنا پڑا۔ اور ایک سال بعد ہنگامہ غدر نے دہلی چھڑا دی۔ رام پور پہونچے یہاں بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ نواب کلب علی خاں ولی عہد ریاست کے مصاحب مقرر ہوئے۔ اور داروغہ اصطبل کی خدمت اُن کے سپرد ہوئی۔ کلب علی خاں کی زندگی میں داغ کہیں نہ گئے۔ ان کے انتقال کے بعد حیدرآباد آئے یہاں بھی ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ نظام دکن میر محبوب علی خاں کے اُستاد مقرر ہوئے۔ بڑی تنخواہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً انعام بھی پاتے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں بعارضہ فالج حیدرآباد میں انتقال کیا۔

تصانیف میں چار دیوان، ایک مثنوی اور اس کے علاوہ قصائد قطعات اور رباعیات بھی ہیں۔ دہلی کی تباہی ایک موثر شہر آشوب لکھا جو بہت مشہور ہوا داغ کی طبیعت میں غضب کا بانکپن اور زندگی میں قیامت کی چونچالی تھی۔ زندگی کی لذتوں سے بحد طلب بہرہ اندوز ہوئے۔ طبیعت کی یہی چونچالی یہی بانکپن، رندانہ بدمستیوں کی یہی لطیف چھیڑ چھاڑ کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ داغ کے شعری آہنگ میں نہ فلسفہ کی گہرائی ہے۔ نہ دل میں نوک نشتر بن کر رہ جانے والی نظر، ان کی دنیا، خواہش دل کے کامیاب تجربوں اور لذت طلبی کی واردات کی دنیا ہے۔ اس دنیا کے رمز و کیف میں اُنکی نظر ماہرانہ ہے۔ اور اُن کی شاعری کا جادو اس نظر آفریدہ ہے۔ بعض اوقات کلام میں بہت سطحیت آگئی ہے داغ کی کامیاب شعر گوئی کا بڑا راز اُن کی زبان میں مضمر ہے۔ عربی و فارسی کے نامانوس، موٹے موٹے الفاظ، دوراز کار

تشبیہوں اور استعاروں اور پیچیدہ اسلوب بیان سے انھوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ گریز کیا ہے۔ سادہ زبان، میٹھے و رسیلے الفاظ ترنم میں ڈوبا ہوا لہجہ اور لطیف جذبات پیدا کرنیوالا آہنگ یہ ہے۔ داغ کا انداز شعر گوئی محاوروں کے برتنے پر انھیں حاکمانہ قدرت تھی اور محاوروں کے برمحل استعمال سے انھوں نے بیان میں خوب خوب لذت آفرینی کی ہے۔ ذوق نے زبان میں سادگی اور صفائی پیدا کرنے کا جو اصلاحی عمل شروع کیا تھا۔ داغ نے استادانہ محاورت کے ساتھ اُسے نقطۂ عروج پر پہونچا دیا۔ داغ کو جو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی اس کا خاص سبب ان کا لطیف انداز بیان ہے۔ جو زبان کی سادگی اور پرکاری کا حیرت انگیز نمونہ ہے:۔

# امیر مینائی

داغ اور امیر شاعری کے میدان میں حریفانہ حیثیت سے ممتاز رہے ہے داغ دہلی کے چمن خوشنوائی کے بلبل ہزار داستان تھے۔ اور امیر کے دم سے دبستان لکھنؤ کی آخری بہار قائم تھی۔ امیر احمد نام اور امیر تخلص تھا۔ لکھنؤ میں بعہد بادشاہ نصیر الدین حیدر پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی اور عربی و فارسی علوم کی تحصیل فرنگی محل میں کی، طب، نجوم، جفر، وغیرہ سے بھی واقفیت حاصل کی لکھنؤ اس زمانے میں علوم، فن اور شعر و سخن کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ شاعری کا گھر گھر چرچا تھا۔ اور ساری فضا شاعرانہ زمزمہ سنجیوں سے گونج رہی تھی۔ امیر نے بھی بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس کوچہ میں قدم رکھا۔ اسیر کے شاگرد ہوئے مہربان استاد نے ہونہار شاگرد کی تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ استاد کے ساتھ واجد علی شاہ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی۔ دو کتابیں "ارشاد السلطان"

اور "ہدایت السلطان" لکھ کر بادشاہ کے دربار میں پیش کیں۔ اور خلعت سے بہرہ یاب ہوئے۔ قیصر باغ کی رنگ رلیاں امیر جیسے دین دار صاحب شریعت کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ جا بجا کلام میں یہ رنگ رلیاں بے اختیار جھلک پڑتی ہیں۔ واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ لکھنؤ کی رونق بھی رخصت ہو گئی۔ جو کچھ رہ گیا تھا وہ ہنگامۂ غدر کی نذر ہو گیا۔ امیر کو بھی لکھنؤ چھوڑنا پڑا۔ مختلف جگہ پھرتے پھراتے رام پور پہنچے۔ یہاں بڑی عزت ہوئی۔ نواب رام پور کلام پر اصلاح لینے لگے امیر نے بڑی طویل مدت رام پور میں گذار دی آخر میں حیدر آباد آ گئے۔ حیدر آباد میں چند ہی روز گزرے تھے۔ کہ موت نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ۱۹۰۰ء میں انتقال ہوا۔

امیر بڑے پایہ کے عالم تھے۔ شاعری کے علاوہ ان کی دوسری علمی ادبی خدمات بھی بہت قابل قدر ہیں۔ اُن کی زندگی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ان کی نا تمام لغت "امیر اللغات" ہے۔ جس سے اُن کے علمی مرتبہ جامعیت اور جانفشانی کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ "بہار ہند" اور محاورات و الفاظ کی ایک مختصر لغت ہے۔ جس کو اللغات کا نقش قدم اول کہنا چاہیے۔ "سرمہ بصیرت" ایسے عربی و فارسی الفاظ کی فرہنگ ہے جو اردو میں غلط استعمال ہوتے ہیں ان کا صحیح طریقۂ استعمال بمعہ اسناد بتایا گیا ہے۔ انتخاب یادگار کے نام سے انھوں نے نواب کلب علی خاں کے حکم سے رام پور کے شعرائے اردو کا تذکرہ مرتب کیا ہے۔ بزبان فارسی نثر میں مولود شریف ہے۔ شاعری میں بھی ان کے کارناموں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ امیر کی طبیعت میں مذہبی جوش کا ایک خاص ظہور ہے۔ ان کی دو مثنویاں "صبح تجلی" اور "ابر کرم" اور کئی مسدس مذہبی جذبات سے لبریز ہیں۔ "محامد خاتم النبیین" کے نام سے ان کا ایک

نعتیہ دیوان بھی ہے۔ قصائد اور واسوخت کے اصناف کو بھی آمیر کی جولانی طبع نے سیراب کیا ہے۔ امیر کے واسوخت ماحول کی بڑی دلکش تصویر پیش کرتے ہیں۔ غزل گوئی کے میدان میں آمیر داغ کے حریف رہے ہیں۔ ان کے پہلے دیوان "مراۃ الغیب" میں لکھنؤ کی شاعری کی خصوصیات پورے طور پر نمایاں ہیں۔ کلام میں کم مشقگی کی ناپختگی بھی ہے۔ دوسرا دیوان داغ کے طرز سخن وری پر ہے۔ اور اس میں اعلیٰ تخیل سلاست و روانی اور دلکش عاشقانہ ترکیبیں بہ کثرت موجود ہیں۔ امیر نے بڑی شاعرانہ زور آوری کے ساتھ داغ کے ہم آہنگ ہونیکی کوشش کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر کے شیوہ گفتار کی طرح داغ کا شیوہ گفتار بھی انھیں کے بس کی بات ہے۔ امیر اچھے معیار کی شاعرانہ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہیں۔ مختلف اصناف نظم پر ان کو قدرت حاصل ہے شگفتگی، لطافت، خیالی، زور بیان، شاعرانہ صنعت کی اکثر و بیشتر خصوصیات ان کے یہاں بڑے حسن کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ تصوف کی چاشنی بھی موجود ہے اور کہیں کہیں دل کی تڑپ پیدا ہو گئی ہے۔ آمیر کا کلام عام طور سے صاف اور سلیس ہے اور روزمرہ اور محاورات کے لحاظ لکھنؤ کی زبان کا بہترین نمونہ ہے۔

# جلالؔ لکھنوی

سید ضامن علی جلالؔ حکیموں کے ایک نامور خاندان میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر حاصل کی طب کی طرف بھی توجہ رکھی لیکن زیادہ انہماک شاعری کی طرف رہا۔ پہلے علی اوسط رشک اور پھر برق سے کلام پر اصلاح لی۔ طبیعت شعر گوئی کے لئے موزوں لائے تھے

لکھنؤ کے رنگین ماحول اور باکمال شعرائ کی صحبت نے اس دور کو جہ کا بایہ مشاعروں میں شریک ہونے لگے اور دادِ سخن پانے لگے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد یہ بزم شعر و ادب منتشر ہو گئی۔ جلال بھی کچھ دنوں کے بعد رام پور پہونچ گئے۔ جہاں امیر۔ داغ۔ تسلیم جیسے استادِ فن گرمی صحبت پیدا کئے ہوئے تھے۔ نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد ریاست منگرول چلے گئے۔ لیکن وہاں قیام بہت قلیل عرصہ رہا۔ لکھنؤ واپس آ گئے۔ اور ۱۹۰۹ء میں ۷۷ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ شاعری کے علاوہ جلال نے زبان کی جو خدمت کی ہے وہ بہت قابلِ قدر ہے۔ وہ ناسخ اسکول کے بہت بڑے پیرو تھے۔ الفاظ کی صحت محاوروں کی درستی اور عروض و قواعد کے مسائل پر ہمہ وقت ان کی نگاہ رہتی تھی۔ زبان کو علمی نقطۂ نظر کو منظم کرنے میں انھوں نے بڑی قابلیت کا دش، جانفشانی سے ثبوت دیا۔ بہ حیثیت ماہر زبان اپنے دور میں منصب استادی پر فائز ہو گئے۔ اُن کی مشہور کتاب "سرمایہ زبان اردو" اردو محاوروں کی ایک بہت مستند لغت ہے۔ لغت اور زبان پر ان کی کتابیں بھی ہیں۔ جلال ناسخ اسکول کے پیرو تھے۔ اس لئے ان کے یہاں بیان کی رعنائی و زیبائش اور الفاظ و محاورات پر بڑا زور صرف ہوا ہے۔ ظاہر ہوا ہے کہ یہ چیزیں تخئیل سے بیساختگی اور بلند عمل میں مزاحم ہو جاتی ہیں۔ لیکن جلال کی طبیعت میں سچی شعر گوئی کا مادہ بھی تھا۔ ان کے کلام کا ایک حصہ ایسا ہے جس میں پیروی میر کی صاف جھلک ہے۔ اور جس میں تغزل کی حقیقی شان موجود ہے۔ زبان کی سادگی کلام کی تاثیر اور خیال کی معنویت میں ڈوبے ہوئے ہیں وہ اپنی نظیر ہیں جلال نے قصیدہ نگاری میں بھی زورِ کلام دکھایا ہے۔ لیکن اس صنف میں وہ کوئی خاص امتیاز نہیں پیدا کر سکے۔ علمی تصانیف کے علاوہ جلال کے چار دیوان ہیں۔ جو ان کی سخنورانہ مشاقی کے شاہد ہیں۔

# اردو نثر ۱۸۵۷ء تک

**اردو نثر دکن میں** — ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اردو میں تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں آغاز دکن میں ہوا۔ اور اس سے پہلے کہ شمالی ہند میں اردو زبان کی صورت اختیار کر کے ادبی ثمر آفرینی کرے دکن کے اہل کمال نے ایک شاندار ادبی ذخیرہ پیدا کر دیا۔ دکنی ادب کے ابتدائی نقوش صوفیا کے قلم سے قایم کئے ان بزرگوں نے مذہبی احکام اور روحانیت کے اسرار عوام تک پہنچانے کے لئے ملکی زبان کو وسیلہ بنایا۔ دکنی مذہبی ادب کا آغاز چودھویں صدی کے وسط یعنی بہمنی حکومت کے زمانہ قیام سے ہو گیا تھا۔ دکنی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے ہم عہد بعید کے مدارج ترقی اور ممتاز اہل قلم اور نامور ارباب ادب کی تحریروں اور کارناموں پر تبصرہ کر چکے ہیں۔ یہاں ہم بہت اختصار کے ساتھ سلسلۂ ارتقاء کی باضابطگی کی خاطر دکن کے نثر نگاروں کا ذکر کریں گے۔

دکنی نثر کا بیشتر حصہ صوفیا کے مذہبی رسائل پر مشتمل ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۱ء تا ۱۴۲۲ء) کا ہے انھوں نے دو مذہبی رسالے تصنیف کئے۔ معراج العاشقین اور ہدایت نامہ معراج العاشقین کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے۔ کہ یہ اردو نثر کا قدیم ترین مطبوعہ نمونہ ہے۔ چودھویں صدی کے آخر میں خواجہ گیسو دراز کے پوتے سید عبداللہ حسینی نے شیخ عبدالقادر جیلانی کے عربی رسالے کا ترجمہ کر کے

اس کی شرح بھی لکھی۔ اس زمانے میں حضرت گیسو دراز کے ایک مرید نے اپنے مرشد کے ملفوظات کی شرح ہفت اسرار کے نام سے مرتب کی۔ دکن کے صوفی ادیبوں میں شاہ میراں جی شمس العشاق کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انھوں نے نظم کے علاوہ نثر کو بھی اپنے فیضان سے سیراب کیا۔ تین رسالے شرح، مرغوب القلوب گل باس، اور جل ترنگ اُن کے نام کے ساتھ منسوب کیے جاتے ہیں۔ ان کے پوتے امین الدین اعلیٰ (۱۵۵۵ء تا ۱۶۷۶ء) کے رسائل نثر میں "گفتار حضرت شاہ امین" اور گنج مخفی بہت ہی اہم ہیں۔ ۱۲۶۲ھ میں مولوی عبداللہ نے "احکام الصلوٰۃ" کے نام سے ایک فارسی مذہبی رسالہ کا ترجمہ کیا۔ جس میں نماز کے آداب اور حنیفہ عقائد بیان کیے گئے ہیں۔ ۱۸۶۸ء دکن کے ایک صوفی بزرگ میراں یعقوب نے حضرت خواجہ برہان الدین کی کتاب شمائل الاتقیاء کا اردو میں ترجمہ کیا۔ شمائل الاتقیاء کا نمایاں وصف زبان کی سادگی اور بیان کی دل کشی ہے۔

## دکن کا یادگار نثری شاہکار

نثر کے جن رسائل کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے۔ یہ سب تصوف اور مذہب سے متعلق ہیں۔ ان کا مقصد وعظ و تبلیغ ہے۔ ان رسائل کو ادبی معیار پر پرکھنا اور ان کے اندر فکر و فن کے لوازم تلاش کرنا مناسب نہیں ہے۔ ان کی اہمیت ادبی نہیں۔ خالص لسانی ہے۔ ان کے رسائل کے مطالعہ سے دکن میں اردو کے ابتدائی روپ اور بعد کے تغیرات کا اچھا اندازہ ہوتا ہے۔ ادبی حیثیت سے دکنی نثر کا قابلِ رشک کارنامہ عہد قطب شاہی کے مشہور ادیب وشاعر ملا وجہی کی تصنیف "سب رس" ہے۔ جس میں عشق و دل کے معرکہ کو قصہ کے پیرایہ میں رمز و کنایہ کی بڑی دلآویزیوں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کی

عبارت ایک خاص ادبی رنگ رکھتی ہے۔ فارسی کے عام طرز انشا پر "سب رس" کی زبان مقفیٰ اور مسجع ہے۔ لیکن روانی اور سلاست بہت کافی ہے۔ مصنف کی رنگینیِ فکر کتاب میں جا بجا بڑی دلکشی پیدا کر دیتی ہے۔ پند و نصائح کی کثرت کہیں کہیں قصہ کے تسلسل کو بری طرح مجروح کر دیتی ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ کتاب ادبی اور لسانی دونوں لحاظ سے بڑے اہم مطالعہ کی مستحق ہے۔ "سب رس" دکنی ادب کے یادگار کارناموں میں ممتاز مقام رکھتی ہے۔

---

# شمالی ہند

---

شمالی ہند میں اردو شعر گوئی کا عام رواج محمد شاہ رنگیلے ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء کے عہد سے ہوا۔ جب ولی دکنی دربار "ورود دہلی" نے دارالسلطنت میں ادبی چہل پہل کی نئی فضا پیدا کر دی۔ شمالی ہند کے باکمالوں نے اس ذوق و شوق۔ طبیعت داری اور فن کے رچاؤ کے ساتھ اور شاعری کو وسیلۂ اظہارِ خیال بنایا کہ بہت جلد اسی کا بلند فنی معیار قائم ہو گیا۔ لیکن شمالی ہند میں ادب و زندگی پر فارسی کا تسلط اس قدر شدید اور قوی تھا کہ اردو نے بڑی صبر آزما منزل طے کر کے اور ایک حد تک اور اپنا جوہر کھو کر باقاعدہ ادبی حیثیت اختیار کی ۱۸۰۰ء تک شمالی ہند میں اردو نثر نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔

اب تک عام خیال یہ تھا کہ شمالی ہند میں اردو نثر کی پہلی کتاب فضلی کی "دہ مجلس" ہے۔ جس کا سال تصنیف ۱۷۳۲ء ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری کی تلاش و تحقیق نے ایک اردو رسالہ کا پتہ لگایا ہے۔ جو "دہ مجلس" سے سوا چار سو برس پہلے ۱۳۰۸ء میں تصنیف ہوا۔ اس کے مصنف خواجہ سید جہانگیر اشرف سمنانی ہیں۔ رسالہ اخلاق و تصوف سے متعلق ہے۔ اس کی تمام تر اہمیت لسانی ہے۔ فضلی کی "دہ مجلس" مروجہ فارسی رنگ انشا میں ڈوبی ہوئی ہے۔ عبارت مقفیٰ و مسجع ہے۔ اور عربی و فارسی الفاظ کی بہتات ہے۔ سودا نے اپنی کلیات کی ابتدا میں جو اردو دیباچہ لکھا ہے۔ اس میں بھی یہی رنگ نمایاں ہے۔ دیباچہ کا ایک جملہ ہے۔ "ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے۔ جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو" اس زمانے کی ایک اور مشہور کتاب میر محمد عطا حسین خان تحسین کی "نوطرز مرصع" ہے یہ کتاب فارسی کے مشہور قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ اس کا سال تصنیف ۱۷۹۸ء ہے۔ "نوطرز مرصع" کی عبارت بھی رنگ آرائی اور اس دور کے مروجہ طرز نگارش کے فنی لوازم سے مملو ہے۔

۱۸۰۰ء سے لے کر ۱۸۶۰ء تک کا دور جس کے بعد نئے زمانہ کے اثرات اور زندگی کے نئے تصورات کے تحت شعر و ادب کی نئی بنیادیں پڑیں اور نئے معیار قایم ہوئے۔ اردو نثر کی ترقی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں محدود پیمانے پر سہی لیکن روایت پرستی اور تصنع نوازی کی حدیں ٹوٹیں ادب میں فطری جوہر نمود کی شان ابھری۔ زبان نے علمی رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ اور ذہن و زندگی سے اس کے زیادہ حقیقی، نتیجہ خیز اور صالح رشتے قایم ہوئے۔ اس دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انفرادی خدمت

ادب کے ساتھ ساتھ ادارے بھی منظم طریق پر واضح مقاصد کے ساتھ اردو کے لئے سرگرم کار نظر آتے ہیں۔ ساٹھ برس کی مدت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اس دور کی یادگار ادبی تصانیف کی تعداد بہت کم ہے لیکن زبان کی ترقی کاروباری زندگی اور سرکاری انتظام میں عمل دخل اور آزاد مشربی کی بے راہ روی کے بجائے اس میں ضابطہ اور تنظیم کی شان پیدا ہونے کے لحاظ سے اس دور کی اہمیت خاص مطالعے کی مستحق ہے۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا۔ اس کالج کے قیام نے اردو کی رفتار ترقی پر بڑے خوشگوار اثرات مرتب کئے۔ فورٹ ولیم کالج کی خدمات زبانِ اردو تاریخ ادب میں بڑی قابل قدر حیثیت رکھتی ہیں۔

## فورٹ ولیم کالج!

ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں یہ کالج اس مقصد سے قائم ہوا کہ کمپنی کے انگریز ملازموں کو اردو سے واقف کیا جائے۔ اردو کی روزافزوں مقبولیت کو دیکھ کر فرنگی دانشوروں نے اسکے روشن امکانات اور شاندار مستقبل کا بہت صحیح اندازہ کرلیا۔ اور عوامی زندگی میں اپنے تسلط کو زیادہ گہرائی اور مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کی لئے اسکی سرپرستی کی طرف قدم اٹھایا۔ فورٹ ولیم کالج اردو ادب کی ترویج و ترقی کا ایک یادگار مرکز بن گیا۔ اس کالج کے قیام و تنظیم میں ڈاکٹر جان گلگرسٹ کے تجربوں اور کوششوں کو نمایاں امتیاز حاصل ہے۔ وہ اس کالج کے شعبہ اردو کے پہلے پروفیسر تھے۔ گلگرسٹ نے اردو زبان کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے بڑی محنت سے اردو زبان کی لغت اور گرامر مرتب کی اور ہندوستانی لسانیات پر اچھے معیار کا تحقیقی کام کیا۔ گلگرسٹ نے کالج میں ممتاز

انشاپردازوں اور اہل قلم کو جمع کرکے آسان اور عام فہم زبان میں کتابیں لکھوائیں کالج کی فضا میں اردو کو صالح اور توانا ماحول میں ترقی کرنے کا موقع ملا۔ اردو میں نثری ادب پیدا ہوا اور بہت جلد یہ صلاحیت پیدا ہو گئی۔ کہ فارسی کی جگہ سرکاری حیثیت اختیار کرلی۔ فورٹ ولیم کالج کے نامور اہل قلم میرامن، حیدر بخش، حیدری شبیر علی، افسوس، بہادر علی حسینی، کاظم علی جوان۔ مظہر علی خاں، ولا۔ نہال چند لاہوری۔ للولال جی، حفیظ الدین احمد، مولوی اکرام علی اور مرزا علی لطف ہیں

**میرامن دہلوی** :- فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں میں سب سے زیادہ ممتاز حیثیت میرامن دہلوی کو حاصل ہے۔ ان کی مشہور تصنیف "باغ و بہار" اردو نثر کی زندۂ جاوید کتابوں میں ہے۔ یہ کتاب طبع زاد نہیں۔ فارسی کے مشہور قصہ چہار درویش کا ترجمہ ہے۔ لیکن میرامن نے اس قصہ کو اس قدر رواں شگفتہ اور دلچسپ فطری انداز میں بے تکلفی اور لطف بیان کے ساتھ سنایا ہے کہ "ترجمہ پن" کی کہیں سے ہوا بھی نہیں لگنے پائی۔ ہندوستانی ماحول اور سماجی زندگی اسی شان اور واقعیت کے ساتھ اس میں جگہ دی ہے۔ کہ کتاب میں طبع زاد تصنیف کا انداز پیدا ہو گیا ہے باغ و بہار دہلی کی ٹکسالی زبان میں لکھی ہوئی ہے۔ اس میں محاوروں کا بہت برمحل مصرف ہوا ہے۔ مشاقی فن اور قدرت زبان نے بیان میں لوچ، نکھار، نفاست اور دلکشی کے موتی بکھیر دیئے ہیں۔ اس کتاب میں جذبات نگاری کے اچھے نمونے ملتے ہیں مکالموں میں حفظ مراتب، موقع محل کا لحاظ اور نغمات، وجذبات کا پاس وخیال کہیں کہیں اس قدر فطری واقعیت اور فنی بصیرت کے روشن پہلو لے کر ابھرتا ہے۔ کہ قصہ گوئی میں ناول کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ "باغ و بہار کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اس دور کی دہلی کی سوسائیٹی کی بڑی شاندار تصویریں ملتی ہیں۔ باغ و بہار۔ کا اسلوب نگارش، سادہ نگاری کا ایک بہت دلکش نمونہ ہے۔ اس

سدا بہار کتاب کا سال تصنیف ۱۸۰۱ء ہے۔

۱۸۰۲ء میں میر امن دہلوی نے ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور تصنیف "اخلاق محسنی" کا ترجمہ "گنج خوبی" کے نام سے کیا لیکن اسے کوئی مقبولیت نہ حاصل ہو سکی۔

**حیدر بخش حیدری** — متوفی ۱۸۲۸ء۔ حیدر علی دہلی کے رہنے والے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے ادیبوں میں انھوں نے بھی اپنے لئے اچھی جگہ پیدا کی۔ حیدری نے فارسی سے بہت سی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ ان کی مشہور کتابوں میں یہ ہیں۔ (۱) آرائش محفل (۱۸۰۰ء) یہ حاتم طائی کا قصہ ہے (۲) طوطا کہانی یہ محمد قادری کے "طوطی نامہ" کا اردو ترجمہ ہے (۳) گلزار دانش "فارسی کی مشہور کتاب "بہار دانش" کا ترجمہ ہے۔ (۴) تاریخ نادری "فارسی تصنیف" جہاں کشائے نادری" کا ترجمہ ہے۔ (۵) گل مغفرت "یہ کاشفی کی "روضتہ الشہدا" کا ترجمہ ہے۔

حیدری کی زبان بہت سیدھی سادھی اور با محاورہ ہوتی ہے۔ وہ بہت بے تکلفی سے لکھتے ہیں۔ اسلئے ان کی تحریروں میں کوئی الجھاؤ پیدا ہونے نہیں پاتا۔ ان کی نثر ایک حد تک آجکل کی عام زبان سے بہت ملتی جلتی ہے۔ حیدری نظمیں اور غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کی شاعرانہ حیثیت قابل لحاظ نہیں ہے۔

**شبیر علی افسوس** — افسوس دہلی کے رہنے والے تھے۔ شاعری کا اچھا مذاق رکھتے تھے۔ ان کی کتاب "آرائش محفل" جو سبحان رائے کی فارسی تاریخ خلاصتہ التواریخ" پر مبنی ہے بہت مشہور ہے۔ افسوس نے ترجمہ میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے۔ اس لئے اس کتاب کی حیثیت مستقل تصنیف کی ہے۔ انھوں نے شیخ سعدی کی گلستاں کا ترجمہ "باغ اردو" کے نام سے کیا ہے۔ اس تصانیف کے علاوہ افسوس کی اور بھی ادبی خدمات ہیں۔ انھوں نے سودا کے کلیات کو صحیح کر کے دوبارہ شائع کیا۔ ان کا خود بھی ایک دیوان ہے۔ جو اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ انھوں

نے فورٹ ولیم کالج کے زیر نگرانی کئی کتابوں کی نظر ثانی بھی کی تھی۔ افسوس فورٹ ولیم کالج کے ادبا میں بڑی حیثیت رکھتے تھے۔)

**بہادر علی حسینی** — فورٹ ولیم کالج میں میر منشی تھے۔ انھوں نے میر حسن کی زندہ جاوید مثنوی "سحر البیان" کو نثر "بے نظیر" کے نام سے نثر کے قالب میں پیش کیا۔ حیدری کی تصانیف میں "اخلاقِ ہندی" اور ترجمہ تاریخ آسام خاصی شہرت رکھتی ہیں۔ انھوں نے گلکرسٹ صاحب کی گرامر کا خلاصہ رسالہ گلکرسٹ کے نام سے لکھا۔ ان کتابیات کے علاوہ انھوں نے قرآن شریف اور قصہ لقمان کے قصہ میں بھی مدد کی تھی۔

**کاظم علی جوان** — کاظم علی جوان کا وطن لکھنو تھا۔ لکھنو کی قدر دانی نے ارضِ شام اودھ میں پہونچا دیا۔ یہاں سے ان کا انتخاب فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں ہو گیا۔ ان کی تین تصانیف مشہور ہیں۔ (۱) "شکنتلا" کالیداس کے اس مشہور عام ڈرامہ کا ترجمہ انھوں نے برج بھاشا کے ترجمہ کیا۔ (۲) "بارہ ماسہ" اس میں ہندوستان کی فصلوں اور ہندو مسلمانوں کے تہواروں کا منظوم بیان ہے (۳) ترجمہ تاریخ فرشتہ متعلقہ خاندان بہمنی۔ ان کتابوں کے علاوہ انھوں نے قرآن مجید کے اردو ترجمہ کو بھی درست کیا اور مولوی حفیظ الدین کی تصنیف "خرد افروز" پر بھی نظر ثانی کی۔ میر و سودا کی کچھ منتخبات بھی شائع کئے۔

**مظہر علی خاں ولا** — مرزا لطف علی نام اور تخلص ولا تھا۔ عرف عام میں مظہر کہلاتے۔ ولا فارسی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی کے بھی [illegible] مصحفی کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا تھا۔ انھوں نے بہت سی کتابوں کے ترجمے کئے مثلاً (۱) مادھونل اور کام کندلا۔ موتی رام بشر کی ہندی کتاب کا ترجمہ ہے (۲) ہفت گلشن، ناصر علی خاں کی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ (۳) بیتال پچیسی

اس سنسکرت مجموعہ قصص کا برج بھاشا سے اردو میں ترجمہ کیا۔ ہم تاریخ شیر شاہی کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا (۵) جہانگیر نامہ، تزک جہانگیری۔

**نہال چند لاہوری** — نہال چند لاہوری نے گل بکاؤلی کے مشہور قصے کا فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "مذہب عشق" رکھا۔

**حفیظ الدین** — انھوں نے ۱۸۰۳ء میں ابوالفضل کی کتاب "عیار دانش" کا ترجمہ اردو میں کیا۔ ترجمہ کا نام "خرد افروز" ہے۔ اور یہ فورٹ ولیم کالج کی بڑی مشہور کتابوں میں ہے۔

**مولوی اکرام علی** — انھوں نے عربی کی مشہور کتاب "اخوان الصفا" کے ایک حصے کا سادہ علمی نثر میں ترجمہ کیا۔

**للو لال جی** — انھوں نے زیادہ ہندی زبان میں لکھا ہے۔ کاظم علی جوان کے ساتھ مل کر انھوں نے اردو میں سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ ہندی کتابوں کے ترجمے میں انھوں نے جوان اور ولا کی مدد بھی کی۔ ۱۸۱۰ء میں انھوں نے لطائف ہندی کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ جس میں کچھ ہندی اور کچھ اردو ہے۔

**مرزا علی لطف** — مرزا علی لطف کی شہرت ان کے تذکرہ شعراء کی بدولت ہے۔ جس کا نام "تذکرہ گلشن ہند" ہے۔ اس تذکرہ میں اس زمانہ کے مشہور شاعروں کے بڑے دلچسپ حالات ملتے ہیں۔ صحتِ واقعات کے لحاظ سے یہ تذکرہ زیادہ معتبر نہیں ہے۔ اور اس کی عبارت بھی بہت پرتکلف اور مسجع و مقفیٰ ہے۔

فورٹ ولیم کالج کی نثری تصانیف پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں صرف قصے کہانیاں نہیں ہیں۔ بلکہ تاریخ، اخلاق، مواعظ، سوانح عمری اور

علم اللسان پر بھی کچھ نہ کچھ سرمایہ موجود ہے۔ سب سے بڑی اور قابل قدر خدمت جو اس کالج نے انجام دی یہ ہے کہ اس کے کالج کے زیر اثر ادیبوں اور انشاء پردازوں نے انجام دی یہ ہے کہ اس کا کوترک کر کے سادہ نگاری کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ اس طرح اردو ادب میں عوامی مقبولیت کے عناصر زیادہ قوی ہو گئے۔ تدوین زبان کے اقدام اور سلاست نگاری طرز سے ملک کے عام فضاء پر یہ اثر پڑا کہ رفتہ رفتہ مغلق اور رنگین عبارت غیر مقبول ہونے لگی۔ اور سادگی بیان ادبی جوہر بنکر ابھرنے لگی۔ اردو زبان کی لغت اور گرامر پر عام توجہ ہوئی۔ اور اردو کو ایک باقاعدہ زبان بنانے کی کوششوں میں زیادہ ضابطگی اور مستعدی آگئی۔

انیسوی صدی کے پہلے ساٹھ سال، اردو کی ادبی ہمہ گیری کے لئے زمین ہموار ہونے کا زمانہ ہے۔ اس دور میں حلقے مختلف سمتوں اور مختلف حیثیتوں سے اردو کی عام مقبولیت اور کوچہ بازاری کی زندگی میں اس کی عمل دخل نے مذہبی سیاسی، تعلیمی اور ادبی حلقوں، غرض ایک عالم کی نظر میں اس زبان کو قابل اعتنا و اعتبار اور لائق سرپرستی بنا دیا تھا۔ اس ہمہ گیر توجہ کی بدولت اردو نے ترقی کی منزلیں بہت تیز گامی کے ساتھ طے کیں۔

## شاہ ولی اللہ کا خاندان اور اردو کی خدمت۔

اردو کی ترویج و اشاعت میں اس حیرت انگیز علمی و دینی امتیازات و کمالات رکھنے والے خاندان کا بھی ہاتھ ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے فرزند شاہ رفیع الدین نے قرآن کریم کا سب سے پہلا اردو ترجمہ کیا۔ شاہ رفیع الدین کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالقادر نے ایک دوسرا ترجمہ قرآن شریف کا کیا۔ اور ایک تفسیر موضع القرآن کے نام سے لکھی۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ نہایت سلیس اور بامحاورہ اردو میں ہے۔ اس ترجمہ کا حیرت انگیز کمال یہ ہے۔ کہ بڑی نازک علمی اور الہیاتی باتوں

کو نہایت عام فہم بھروسہ ہے۔ اور متین زبان میں ادا کیا ہے۔ یہ ترجمہ اپنی
مقبولیت کے لحاظ سے آج بھی اپنی نظیر آپ ہے۔ اسی خاندان کے فیض تعلیم
اور تربیت سے وہ زبردست تحریک جہاد اٹھی۔ جس نے پورے ملک میں
عزم و ہمت کا صور پھونک دیا۔ اس تحریک کی قیادت رائے بریلی کے مشہور
زمانہ عالم دین حضرت سید احمد بریلوی کے ہاتھ میں تھی۔ سید صاحب کے دست
راست شاہ ولی اللہ کے پوتے حضرت اسماعیل شہید تھے۔ اس تحریک نے
اردو کو بہت فائدہ پہنچایا۔ اس تحریک کے سلسلے میں جو لٹریچر شائع ہوا۔ اس سے
اردو کو اچھا عوامی فروغ حاصل ہوا۔ شاہ اسماعیل شہید خود بھی بڑے عالم
اور اہل قلم تھے۔ انھوں نے کئی دینی رسائل تصنیف کئے۔ رسالۂ توحید
صراط مستقیم، تنویر المومنین اور تقویۃ الایمان ان کے بہت مشہور رسائل ہیں

اس سلسلہ میں مسیحی پادریوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ عوام میں اپنے
مذہب کی اشاعت کے لئے پادریوں نے بھی اردو کی سرپرستی کی۔ یکے بعد دیگرے
بائبل کے ترجمے اردو میں ہوئے۔ اور عام دلچسپی کا لٹریچر بھی اردو میں منتقل ہوا

**یورپین علماء اور اردو** — آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا
ہے کہ ہم ان کوششوں کا بھی ذکر کر دیں جو یورپین علماء نے اردو کی تدوین اور
ترقی کے لئے کیں۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی خدمات زبان و ادب کا اجمالی بیان
ہم فورٹ ولیم کالج کے سلسلہ میں کر چکے ہیں۔ یورپین عالموں کی توجہ اردو
کی طرف فورٹ ولیم کالج کے قیام سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ ہندوستان
کی سب سے پہلی گرامر وہ ہے جسے۔ جان جوشوا کیٹیلر نے ۱۷۱۵ء میں مرتب
کیا۔ کیٹیلر نے ہندوستان کی ایک لغت بھی تیار کی تھی۔ جس کو ایک انگریز
ڈیوڈ مل نے جو ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ اس سلسلہ میں یورپ کے مختلف

ممالک مثلاً اٹلی، جرمنی، اور فرانس کے علمار کے نام ملتے ہیں جنہوں نے اردو کی گرامر اور لغت پر توجہ کی کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر نے ایک ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۰۸ء میں مرتب کی۔ جان شیکسپیئر کی ہندوستانی گرامر ۱۸۱۳ء میں اور ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۱۷ء میں شائع ہوئیں۔ یورپین علمار میں سب سے زیادہ ممتاز نام فرانس کے مشہور مستشرق گارسن ڈی تاسی کا ہے جس نے فرانسیسی زبان میں اردو کے متعلق کئی کتابیں تصنیف کیں اور ہندوستانی زبان کے متعلق جس کی لسانی تحقیقات نادر اور بیش بہا علمی ذخیرہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ سر ولیم ہنٹر بانی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ڈاکٹر فیلن پلیٹ اور اور پادری کریون کے نام بھی خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

## تدوین زبان اور ہندوستانی کوششیں

ہندوستانیوں نے بھی تدوین زبان میں بڑی مستعدی اور گرم جوشی دکھائی ۱۸۰۲ء میں انشار اور قتیل کی متحدہ تصنیف "دریائے لطافت" شائع ہوئی جس کو زبان اردو کی سب سے زیادہ مشہور صرف و نحو کی کتاب سمجھنا چاہیئے۔ منشی محمد ابراہیم نے ۱۸۲۳ء میں ایک اُردو کی صرف و نحو معروف تحفہ الفنسٹن لکھی ۱۸۴۵ء میں منشی کریم الدین نے فواعد المبتدی شائع کی۔

## لکھنؤ کی خدمات نثر

یہ دور لکھنؤ میں بڑی ادبی چہل پہل کا زمانہ ہے۔ سوادِ شام اودھ جنت نمو ادب بنا ہوا تھا۔ اور ترانہ ہائے نشاط سرمستی سے فضا معمور تھی۔ نثر کی آرائش

ہیں بھی اہل لکھنؤ نے اپنے طرز اور معیار نظر پر خوب خوب کمال آفرینیاں کیں ہم اختصار کے ساتھ لکھنؤ کے باکمال انشاروں اور لکھنؤ کی خدمات نثر کا ذکر کریں گے۔

**گویا** — متوفی ۱۸۵۰ء فقیر محمد خاں نام اور گویا تخلص تھا۔ فن شعر میں ناسخ کے شاگرد تھے۔ طبیعت میں جوہر ہے گری کے ساتھ علمی و ادبی ذوق کا نکھار بھی تھا انھوں نے "انوار سہیلی" کا ترجمہ "بستانِ حکمت" کے نام سے کیا۔ گویا نے ترجمے میں کافی آزادی برتی ہے۔ اور اپنے ذوق طبیعت سے عبارت و بیان میں بڑے تصرفات کئے ہیں۔ گویا کی یہ کتاب اس دور میں بہت مقبول ہوئی۔ گویا کا رنگ تحریر ایک دلکش عالمانہ رنگ رکھتا ہے۔ عربی و فارسی الفاظ کی کثرت کی وجہ سے ہمارے دور میں گویا کا طرز تحریر بہت زیادہ پسندیدہ نہیں سمجھا جائے گا اور عبارت میں جا بجا ایک قسم کا بوجھل پن اور روانی و شگفتگی کی کمی نظر آئے گی لیکن اس دور میں یہی انداز انشار پردازی کا عام تھا۔ اور سلاست نگاری کا مسلک اختیار کرنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی۔ "بستانِ حکمت" کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اس عبارت مقفی و مسجع نہیں ہے

## رجب علی بیگ سرور

متوفی ۱۸۶۷ء مرزا رجب علی بیگ سرور لکھنؤ کے سب سے بڑے نثار اور قدیم انشار پردازی کے یگانۂ روزگار صاحب فن تھے۔ سرور عربی و فارسی میں اچھا دخل رکھتے تھے۔ اور اپنے زمانے کے اچھے حافظ بھی تھے۔ بڑے شگفتہ طبیعت، خوش مذاق وجیہہ اور طبیعت دار تھے۔ ان کے دوستوں میں مرزا غالب بھی تھے۔ سرور نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کتابوں میں ان کی طبع زاد تصانیف بھی ہیں۔ اور فارسی کے تراجم بھی "سرور سلطانی"، "گلزار سرور"، "انشار سرور"

"شگوفۂ محبت" اور "فسانۂ عجائب" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

سرور کا سب سے زیادہ مشہور اور سب سے بڑا کارنامہ "فسانۂ عجائب" ہے۔ قدیم طرز انشاء پردازی کے معیار پر فسانۂ عجائب حسنِ بیان اور ادبی سحرکاری کا ایک معرکہ آرا نمونہ ہے۔ اس کی زبان مقفٰی و مسجع ہے۔ اور عبارت میں دلکشی پیدا کرنے اور زورِ تخیل کمالِ طبیعت دکھانے کے لئے فن کے آرائشی لوازم سے خوب خوب کام کیا گیا ہے۔ بعض بعض فقرے ادبی مرصع کاری کے بہت اعلیٰ مثال ہیں۔ سرور ادبی بناؤ سنگار کے فن سے بڑی زبردست مہارت رکھتا ہے اور اس نے اسے ایسی قدرت مشاقی اور چابک دستی برتا کہ مذاق قدیم جھوم اٹھا۔

فسانۂ عجائب میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے۔ وہ مشرقی عام کہانیوں کی طرح عشق و محبت کی ایک داستان ہے۔ جس میں مافوق الفطرت عنصر کو بڑا دخل ہے۔ قصہ میں کوئی دل کشی نہیں ہے۔ زبان و بیان کے تصنعات نے اسے اور بوجھل بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں کردار نگاری، جذبات کشی اور سماں آفرینی کی تلاش بالکل بے کار ہے۔ فسانۂ عجائب میں لکھنؤ کی معاشرت و تہذیب شہر کے کوچہ و بازار اور رنگ رلیوں اور چہل و پہل کا بیان خاص مطالعہ کا مستحق ہے۔ یہ بیان بہت متناسب اور خوبصورت ہے۔ خامی یہ ہے کہ یہ محض بیان ہے۔ سارے مناظر فانوسی تصویریں ہیں۔ زندہ و شگفتہ مرقع نگاری مفقود ہے۔ پنڈت برج نرائن درے نے تبصرہ کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے یہ سب تصویریں بے ہوشی کے عالم میں کھینچی ہیں۔" سرور نے فسانۂ عجائب میں میر امن دہلوی پر بڑے لے دے کی ہے ان کی زبان کا مذاق اڑایا ہے۔ تکلف پسندی اور تصنع پرستی کے ماحول میں

گھرے ہوئے ادیب، کبھی ادب کے حقیقی رمزوکیف سے آشنا نہیں ہو پاتے سردر کی بھی بدنصیبی تھی۔ باغ و بہار آج بھی زندہ ادب کا لہلہاتا گلزار ہے "فسانۂ عجائب"، بتدریج ادبی آثار قدیمہ کا جزو بنتی جارہی ہے۔

لکھنؤ کی نثری خدمات کے سلسلے میں مغربی علوم و فنون کی کتابوں کے اردو تراجم کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جو شاہانِ اودھ کی سرپرستی میں ہوتے یہ کتابیں مطبع سلطانی سے شائع ہوئیں۔ اس باب میں سید کمال الدین حیدر لکھنوی کا نام بہت ممتاز ہے۔ جنہوں نے جدید طبیعاتی علوم پر اُنیس[19] رسالوں کا ترجمہ کیا۔

## دلی کالج

اردو کی ترویج و ترقی میں دلی کالج کی خدمات بھی اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کالج نے جدید علوم و فنون کی اشاعت میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ مولوی نذیر احمد، ماسٹر پیارے لال آشوب، مولانا آزاد اور مولوی ذکاءاللہ جیسے رہنما ہیں ادب جنہوں نے اردو کی آئندہ توسیع و ترقی پر زبردست اثر ڈالا اس کالج کے پڑھے ہوئے تھے۔ پروفیسر رام چندر اور مولوی امام بخش صہبائی نے کالج کی فضا کو خدمت اردو کا گہوارہ بنا دیا تھا۔ ان دونوں کی کوششوں سے سنہ ۱۸۴۲ء میں کالج کے زیر پرستی ایک سوسائیٹی قایم ہوئی۔ جس کے اہتمام میں جدید علوم اور سائنس کی کتابیں اردو میں منتقل ہوئیں۔ اور اچھے معیار کی درسی کتابوں کا ایک ذخیرہ فراہم ہو گیا۔

اس قسم کی کتابوں سے سب سے پہلے فائدہ یہ ہوا کہ زبان بہت صاف و سادہ ہو گئی۔ اور اس میں یہ صلاحیت پیدا ہو گئی کہ وہ علمی اور کاروباری ضرورتوں کو آسانی پورا کر سکے۔

**پروفیسر رام چندر** — پروفیسر رام چندر دلی کالج کے بڑے نامور استادوں میں تھے۔ ریاضی ان کا خاص موضوع تھا۔ انگریزی، عربی، فارسی اور اردو میں اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ آپکی سب سے مشہور کتاب "تذکرۃ الکاملین" ہے۔ جس میں دنیا کے بہت سے نامور اہل فن کا تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ دو اور مفید کتابیں "اصول علم ہیئت اور عجائب روزگار" آپ کے قلم سے نکلیں۔ پروفیسر موصوف کا طرز تحریر نہایت سلیس اور رواں ہے۔ ان کے یہاں بے جا طول کلام ہے۔ اور نہ علم نمائی اُنھوں نے عام فہم روزمرہ کی زبان کو بڑے سلیقہ سے برتا ہے۔ زبان اردو کو نئے علوم سے بہرہ ور کرنے میں اُن کی کوشش حد درجہ قابل ستائش ہیں۔ خوش نصیبی نے اُنھیں آزاد، نذیر احمد اور ذکاءاللہ جیسے شاگرد عطا کیے۔

**امام بخش صہبائی** — دلی کالج میں عربی و فارسی کے پروفیسر اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھا۔ دہلی کے ادبی حلقوں میں ان کی حیثیت بہت بلند تھی۔ انھوں نے سرسید مرحوم کو "آثار الصنادید" کی تصنیف میں بہت مدد کی۔ دلی کالج کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں صہبائی کے ذوق دبیحی کو بڑا دخل تھا۔

**غالب** — شاعری کی طرح اردو نثر کے ارتقا میں بھی غالب کا مرتبہ عہد آفریں شان و ادب رکھتا ہے۔ ان کے خطوط کے ادبی روایات پرستی کے آہنی شکنجہ کو توڑ دیا ہے۔ اور سادہ، فطری، بے تکلف طرز نگارش کا ایک ایسا بلند ادبی معیار قایم کیا۔ جو نثر کی آئندہ کمال آفرینی کی تمہید بن گیا۔ غالب نے اس انداز میں خطوط لکھے کہ وہ اُن کے ذہن کے عمل، فکر کی جولانی، دل کی کیفیات، ان کے حالات و مشاہدات اور اُن کی فکرانہ رفعت کا شفاف آئینہ بن گئے۔ طبیعت کی رچی ہوئی شوخی اور اعلیٰ مذاقِ ظرافت نے خطوط میں شگفتگی، زندہ دلی اور لطافت

زبان وبیان کے موتی بکھیر دیئے۔ ان کے خطوط میں شگفتگی، زآداب کے جھمیلے ہیں نہ تصنعات وتکلفات کی گرم بازاری، نہ زورِ انشا دکھانے کا شوق جیسے کوئی بیٹھا بے تکلف باتیں کر رہا ہے۔ طبیعت موج میں ہے۔ فکر رسا شباب پر ہے آمدِ سخن میں علم کے نکتے بھی بیان ہوتے ہیں۔ تنقید کے جوہر بھی کھلتے ہیں۔ بادِ حباب بھی ہوتی ہے۔ آپ بیتی بھی سنائی جاتی ہے۔ ذہن ہے کہ موجِ لطافت کے سہارے کچھ چھیڑتا، کچھ گدگداتا، کچھ ہنسنا کھلانا، فرشِ سبزہ پر چنبیلی کے بکھرے ہوئے پھولوں کا منظر دکھاتا۔ خرامِ نسیم کے بہار کے مانند سرگرمِ کار ہے۔ زخمِ دل ابھر آیا۔ تو اشکِ حسرت، ماتمِ جور و فلک، شکوۂ گردشِ روزگار اس طرح دل و دماغ میں بے اختیار اثر و عبرت کا جادو جاگ اٹھے۔ یقیناً غالب کی تحریر ادب کا لافانی اعجاز ہے۔

خطوط کے علاوہ نثر میں غالب کی چند تقریظیں اور رسائل بھی ہیں لیکن ان کا طرزِ تحریر قدیم رنگِ انشا میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان سے غالب کی علمیت کا پتہ تو چلتا ہے لیکن غالب کی ادبی عظمت کا انحصار ان کے خطوط پر ہے جو آج بھی اپنے رنگ میں بے مثل و بے نظیر ہیں۔ غالب کی مراسلہ نگاری نے اردو نثر کے مخفی امکانات کو اعلیٰ ادبی اجتہاد کے ساتھ روشن کیا۔ سرسید، جن کی تحریروں نے جدید نثر کی بنیاد رکھی ہے۔ صاف طور سے غالب سے متاثر نظر آتے ہیں۔ جدید ادب میں غالب کی شخصیت کے خفی اور جلی بڑے گہرے اثرات ہیں۔

## شہید اور بے خبر

اس دور کے نثر نگاروں میں مولوی غلام امام شہید اور منشی غلام غوث بے خبر نے اچھی شہرت حاصل کی۔ شہید قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے

تھے۔ نعت گوئی اُن کا خاص ذوق تھا۔ مداحِ نبی اور عاشقِ رسول کے لقب سے مشہور ہوئے۔ نثر میں ان کی دو کتابیں ہیں۔ مجموعہ میلاد شریف۔ اور انشائے بہار بے خزاں "شہید کی تحریریں پرانے رنگ کی ہیں۔ عبارت میں قافیہ پیمائی اور رنگین بیانی کا التزام ہے۔ لیکن اس کے باوصف سادگی اور دلچسپی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ تاج گنج پر شہید کا مضمون قدیم طرز انشاء کا ایک بہت شاندار نمونہ ہے۔

منشی غلام غوث بے خبر کی دو تصنیفیں یادگار ہیں۔ ایک کا نام "خونابہ جگر" اور دوسری کا "فغانِ بیخبر" ہے۔ بے خبر عام طور پر صاف اور سلیس نثر لکھتے تھے۔ عبارت میں رنگینی اور تصنع پایا جاتا ہے لیکن مقفیٰ اور مسجع نہیں ہے تقریظوں میں البتہ قدیم رنگ انشا تمام لوازم سمیت ملتا ہے۔

غدر تک اردو نثر کا ارتقاء کا جائزہ جو ہم نے صفحاتِ بالا میں لیا ہے اس کے مطالعہ سے یہ بات بالکل روشن ہو جاتی ہے۔ کہ غدر سے پہلے ہی اردو زبان عام مقبولیت، فطری جوہر نمود اور ہمہ گیر ترقیوں کی صلاحیتوں اور امکانات کی بدولت علمی زبان ہو چکی تھی۔ عام طور پر نگاہیں اس کی اُٹھتی ہوئی جوانی اور ابھرتے ہوئے رنگ و روپ کی گرویدہ ہو رہی تھی۔ اس کے شاعرانہ نغمے پورے ملک کی فضا میں گونج رہے تھے۔ ملکی زندگی میں اردو کے گہرے عمل و دخل کو دیکھ کر ہی انگریزی سرکار نے ۱۸۳۱ء میں اس کو سرکاری زبان کا رتبہ دے دیا تھا۔ یورپین علماء اور ہندوستانی ادیبوں نے اس کی گرامر اور لغت کی تدوین کی طرف توجہ بڑے ذوق و شوق اور علمی بصیرت کے ساتھ مائل کر دی تھی۔ فارسی ادب و انشا پردازی کے قائم کئے ہوئے معیار کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ اور بہت تیزی کے ساتھ نئے اثرات ہمہ گیر

ادبی انقلاب کے لئے زمین تیار کر رہے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف اور اس سے کہیں بڑھ کر غالب کے خطوط نے سلاست نگاری کی بنیادیں اعلیٰ ادبی وقار اور اثر پذیری کے ساتھ قایم کردی تھیں۔

جدید علوم کی انگریزی کتابوں کے تراجم نے اردو کو علمی رنگ دیکر اور اس کے دائرے لغات کو وسیع کر کے اسے توانائی، حوصلے اور زندگی کی امنگ بخشی تھی۔ غالب کی شاعری نے۔ ع

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

کا نعرہ بلند کر کے آنے والے دور کا ترانۂ تہنیت سُنا دیا تھا۔ اردو زبان "ریختہ" دگری پڑی ہی نہیں تھی۔ اس کی غلامی اور احتیاج کا زمانہ گذر چکا تھا۔ وہ ایک مستقل توانا اور ترقی پذیر زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ آٹھ سو برس کی تہذیبی اور سماجی تصادم اور میل وجول کا روشن ترین ظہور، ہند اور ایرانی تہذیبوں کی سموئی نقش آفرینی ہندوستانی کے دل و دماغ کی ترجمان پورے ملک کی قومی زبان۔ آئندہ دور میں اردو کی ترقی اور کمال آفریں کارناموں کی تاریخ روشن تر عنوان کے ساتھ لکھی۔ ؎

# اردو ادب ۱۸۵۷ء کے بعد
# ترقی کی نئی راہیں

۱۸۵۷ء کے انقلاب سے ہندوستان کی زندگی میں ایک فیصلہ کن انقلاب ہو گیا انگریزی حکومت کے باقاعدہ قیام نے مشرق و مغرب کے درمیان بڑے پیمانے پر میل جول کے امکانات پیدا کر دیئے۔ اور اس کے نتیجہ میں، تہذیبی، سماجی، تعلیمی، مختصر یہ کہ ہندوستان کی زندگی کے ہر پہلو میں بڑی اہم اور دور رس تبدیلیوں کے دروازے کھل گئے۔ انگریزی تہذیب اور علم و فنون کا اثر روز بروز تیزی سے بڑھنے لگا اور زندگی کے نئے امکانات اور نئی راہیں روشن ہو گئیں۔ اس زبردست انقلابی عمل نے ہندوستان کی ساری ادبیات کی طرح اردو ادب کو بھی گہرے طور پر متاثر کیا۔ صاف طور پر نظر آتا ہے کہ فکر و نظر کی جولانیوں کے لئے نئے نئے میدان ظہور میں آئے۔ اور اردو ادب کی نئی زندگی کا دور شروع ہوا۔

پچھلے صفحات میں ہم ۱۸۵۷ء تک اردو ادب کی رفتار ترقی کا جائزہ لے چکے ہیں۔ اردو ادب کی ابتدائی ترقی دکن کی زمین پر ہوئی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد شمالی ہندوستان میں شاعرانہ ترانہ گونجے۔ اس کے ادبی مرکز قائم ہوئے اور ادبی و عوامی دونوں حیثیتوں سے اس کو زبردست عروج اور فروغ حاصل ہوا۔ اس طریقہ پر نظر ڈالنے سے یہ چیز بالکل نمایاں ہو جاتی ہے کہ ادب بیشتر شاعری کے دائرہ میں محدود تھا۔ نثر کی طرقی کی طرف بہت کم توجہ کی گئی تھی۔ گویا اردو جوش طبیعت کے اس عالم میں تھی جہاں دل کے جذبات شاعرانہ زمزمہ سنجیوں میں پھوٹ پڑتے ہیں۔ اس کے مزاج میں وہ متانت علمی وقار اور بصیرت کی وہ نگاہیں نہیں آئی تھیں۔ جو مستقبل کو زیر نظر

رکھ کر زندگی کی ترقی کے منصوبے بتاتی ہے۔ اور راہِ عمل کی روشنی بن جاتی ہے۔ یہ چیز صرف اردو کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے۔ دنیا کے ہر ادب کی ابتدا، عروج و فروغ پہلے شاعری ہی کو حاصل ہوا ہے۔ وسیع تر علمی خدمات کے دروازے بعد میں کھلے ہیں۔

ہماری قدیم شاعری میں زندگی کے مختلف موضوعات پر کچھ نہ کچھ ضرور ملجاتا ہے لیکن زیادہ زور حسن و عشق کے لطیف و جذباتی امور کو ادا کرنے پر صرف ہوا ہے۔ فکر کی اعلیٰ ترین بلندیاں بھی اس میدان میں ظاہر ہوئی ہیں۔ اور ہوا و ہوس کے پھاگ بھی اسی خانہ بے تکلف میں کھیلے گئے ہیں۔ غزل ہماری شاعری کا سب سے زیادہ مرغوب اور دل پسند موضوع رہا ہے۔ میر کی لافانی عظمت، غزل کے دامن سے وابستہ ہے۔ مومن کی آسمان سے تارے توڑنے والی فکر غزل کے پیکر میں ڈھل رہی ہے۔ اور غالب نے حیاتِ نو کی صلائے عام ترانۂ غزل ہی میں دی ہے۔ غزل کے علاوہ اور اصنافِ سخن میں بھی بڑے بڑے شاعروں کے کمالات نمایاں ہوئے ہیں۔ قصیدہ، مثنوی، رباعیات، مرثیہ وغیرہ ہماری شاعری میں کافی مقبول رہے ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے ساتھ عوام پسند شاعری کی بڑی جاندار روایت قائم ہوئی۔ نثر میں فورٹ ولیم کالج کی خدمات اور غالب کے خطوط کی حیثیت سے ایک نئے دور کی بنیاد قائم کی ہے۔ قدیم مرصع طرزِ انشا کی بھی بعض کتابیں بڑی حیثیت اور رتبہ کی نکلیں۔ اس ذخیرۂ ادب کو نگاہ میں رکھا جائے۔ تو یہ چیز بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ کہ ادب بہت حد تک بنی بنائی روایتوں میں محصور تھا۔ آزادیٔ فکر اور نئی راہ نکالنے کے امکانات برائے نام تھے۔ یہ چیز بالکل فطری بھی تھی۔ اردو ادب کی ترقی کا دور ہندوستان کی تاریخ میں زوال کے دامن سے وابستہ ہے۔ ایسے زمانہ میں اپنے اختراع اور فکر

آزاد کی زیادہ گنجائش نہیں ہوتی۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب آگیا ملک کی تہذیب و تمدن اور مزاج میں سستی بے عملی فکر کے جمود اور حوصلہ کی کمی سے جو کمزوری پیدا ہوگئی تھی۔ وہ عالم آشکارا ہوگئی۔ اس کا فوری اثر تو یہ ہوا کہ پورے ملک میں افسردگی اور شکست کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن اس کے پائیدار نتائج ہمت مفید و روشن نکلے۔ اصلاح و ترقی کا حوصلہ پیدا ہوا۔ اور زمانے کے قدم بقدم چلنے کی امنگ جولانی کے اٹھان کے ساتھ ابھری۔ اصلاح و ترقی کی اسی زبردست تحریک کا ایک مظہر سر سید احمد خاں تھے، جن کی کوششوں نے جہاں اور نمایاں قومی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہیں نئے انداز پر اردو ادب کی تعمیر و ترقی کے لئے مضبوط بنیاد رکھی۔ جدید ادب واضح اصلاحی مقصد لے کر اٹھا۔ اور اس طرح بامقصد اظہار خیال کی شاندار روایات قائم ہونا شروع ہوئیں۔ انگریزوں کے سیاسی تسلط اور تہذیبی کارفرمائی سے جو قومیں بروئے کار آئی تھیں۔ وہ بالواسطہ اور بلاواسطہ مختلف حیثیتوں سے اس عمل کو تیز کر رہی تھیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں روشن خیال افراد اور نئی انجمنیں اپنے اپنے دائرے میں اس انداز پر مشغول کار تھیں ان کوششوں نے ادب سے بے مقصد تفریح پسندی کو بہت حد تک خارج کیا۔ فکر و خیال کی نئی طرز ڈالی۔ زندگی سے زیادہ قریبی اور گہرے روابط رکھنے والے موضوعات پر قوت شعر گوئی کو صرف کیا۔ اور سنجیدگی و متانت کے ساتھ زبان کو وسیع علمی خدمات کا ذریعہ بنایا۔ آزاد اور حالی کی شاعری کی دنیا میں ایک نئے فن کو رواج دیا۔ اور اسی طرح بے جا روایت پرستی کے وہ شکنجے ٹوٹے۔ جنہوں نے شاعرانہ فکر کو کمزور اور بے جان کر ڈالا تھا۔ نئے دور کی شاعری میں وطن، انسان، مناظر قدرت اور دوسرے موضوعات کو

زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ اور ایک نکھرے سنورے شعور کے ساتھ یہ موضوعات شاعری میں نمایاں ہو گئے۔ نثر نگاری تو ایک طرح سے دورِ جدید ہی کی چیز ہے۔ سرسید۔ آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد نے اپنے زورِ قلم سے نئے زمانوں اور نئے تقاضوں کے مطابق مختلف شعبہ جاتِ نثر کی تنظیم کی اور تاریخ، سوانح، تنقید، علمی و ادبی اور تعلیمی موضوعات، نئے طرز کی ناول نگاری غرض جدید اردو ادب کے ان معماروں کے ہاتھوں وہ بنیادیں پڑیں جن پر ہمارے دور کے ادب کی شاندار عمارت قائم ہے۔

اوپر کی سطروں میں ہم نے جدید اردو ادب کے آغاز کے متعلق چند خاص باتیں کہی ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم جدید ادب کی رفتارِ ترقی اور اپنے زمانے تک اس کی کیفیتِ سفر کا قدرے تفصیل سے جائزہ لیں۔ تاکہ قدیم و جدید ادب کے رابطہ و تعلق اور فرق و امتیاز کا واضح تاریخی تصور آسانی سے قائم کیا جا سکے۔ اور اس کی روشنی میں جدید ادب کے ناموں کی حیثیت زیادہ صفائی اور صحت کے ساتھ نمایاں ہو سکے۔ ادب میں شاعری کو جو اہمیت حاصل ہے۔ اس کے پیشِ نظر پہلے ہم جدید اردو شاعری پر تبصرہ کریں گے۔

# جدید اردو شاعری

نظم — جدید دور میں نظم کو خاص طور سے فروغ حاصل ہوا۔ قدیم شاعری کی ابہام پسندی، روایت پرستی اور ضرورت سے زیادہ مبالغہ آمیز خیال آرائی کے خلاف نئے زمانے میں نئے اثرات کے تحت ایک زبردست تحریک اُٹھی۔ آزاد اور حالی اس میدان میں سب سے پہلے آئے۔ اور اُن کی رفاقت دوسرے حوصلہ مند افراد نے کی۔ آزاد نے نئے طرز کی منظریہ اور تخیلی کی نظمیں لکھ کر ایک نئی روش کی بنیاد ڈالی۔ حالی نے جذبہ کی سچی تڑپ اور حقیقی دل سوزی کے ساتھ اہم معاشرتی اور تمدنی مسائل پر شاعرانہ قوت صرف کر کے ایک تحریک کو بہت مستحکم کر دیا۔ حالی کا زندۂ جاوید مسدس، اردو میں اپنے طرز کی بالکل نئی چیز تھی۔ مسدس نے اسلوب فکر اور اسلوب بیان دونوں میں ایک زبردست تغیر کر دیا۔ اور نئے طرز پر طویل مسلسل نظموں کے لئے راہ ہموار کر دی۔ حالی نے غزل کے خلاف بڑے شد و مد سے آواز اُٹھائی اور انگریزی اثرات کے تحت شاعری میں واقعیت پسندی، خیال و جذبہ کی صداقت، زبان و بیان کی صفائی و سادگی پر بہت زور دیا۔ انگریزی علوم کی اشاعت کے ساتھ ساتھ یہ رُجحان قوی ہونے لگا اور شعر و ادب میں زیادہ بصیرت رکھنے والوں نے نئے رجحان کو قوتِ ذہن اور گرمیٔ فکر کے ساتھ شاعری کے پیکر میں سمویا۔ حالی سرسید کی تحریک اصلاح کے سب سے بڑے آدمی ترجمان تھے۔ انھوں نے کھلے لفظوں میں خوب کی پیروی کا پرچار کیا۔ نئی اصلاح فکر کے خلاف جو طبقہ صف آرا تھا۔ ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی اردو کے مشہور طنزیہ شاعر اکبر الہ آبادی نے کی۔ اکبر قدیم کے دلدادہ اور مغربی تہذیب سے نالاں و بیزار۔ ان کی ذہانت و ظرافت کو اصلاحی مقصد کے لئے فن

کی اس زبردست خامی چابکدستی کے ساتھ برتا کہ ادب برائے زندگی کی ایک نئی راہ روشن ہو گئی۔ خودداری کے احساس اور مغربی علوم کے اثر نے وطن پرستی کو ایک طاقتور جذبہ کے ساتھ ابھارا۔ چکبستؔ اور اقبال کے یہاں وطن پرستی انسانی اور تہذیبی حیثیتوں کے ساتھ ساتھ خالص سیاسی روپ میں بھی ظاہر ہوئی وطن پرستی کے ترانے، مناظر قدرت کے حسن و لطافت میں سرشار ہو کر شاعرانہ زمزمہ سنجیاں تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق کی نئے انداز سے یاد وقت کے مسائل پر خیال آرائی انگریزی کی بعض مقبول نظموں کے ترجمے ۱۹۱۰ء تک تیس پینتیس برس تک مختصر مدت میں جدید اردو شاعری کی راہیں بالکل ہموار ہو گئی تھیں۔ اور اس کے خطوط امتیاز بالکل روشن ہو گئے تھے۔ ملک کی علمی و تہذیبی ترقی اور روزافزوں سیاسی بیداری کے ساتھ شاعری کے دامن پر جولانی فکر کے نئے نقش و نگار ظاہر ہوتے گئے۔ اور کاروبار عشق کی نئے انداز سے ترتیب و تنظیم ہوتی گئی۔ علمی و سیاسی جدوجہد نے شاعری کو مجاہدانہ آہنگ اور جذبہ ترانے اور "کچھ کر جاؤ" کی تمنا نے جاں سپاری کے زمزمے اقبال نے فلسفۂ خودی اور بیخودی کی اشاعت سے اردو شاعری کو حیات آفریں عزم اور فلسفیانہ بلند آہنگی دی۔ اقبال نے ادب برائے زندگی کا ایک بلند فلسفیانہ تصور پیش کیا ہے۔ فکر کے بالکل نئے اور بھرپور عمل سے فن کی تزئین و آرائش کے بالکل نئے سامان اور شاندار ادبی اور شاعرانہ روایتیں پیدا کر دیں۔ اقبال کی شاعری جدید اردو ادب کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اور اس کی بدولت اردو کی ساکھ دنیا کے ادب میں بہت بڑھ گئی ہے۔ وطن پرستی، مشرق پرستی تاریخ قدیم کی عظمت کے ترانے جوشؔ، سیمابؔ، اور حفیظ جالندھری نے اپنے اپنے انداز میں الاپے، اس طرح اردو شاعری کا دامن برابر وسیع ہوتا گیا

اور اُس کے نغموں کی زندگی آفریں کیفیت تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔

ادب برائے زندگی کے تصور کو نئی قوت ترقی پسند تحریک نے دی ہے یہ تحریک منظم طور پر ۱۹۳۵ء میں ظاہر ہوئی۔ اس تحریک کے بانیوں نے اشتراکیت کے اصول و آئین کی روشنی میں ادب کو زندگی سے قریب تر کرنے کی کوشش بڑی آہنگی اور زور و شور سے شروع کی۔ پچیس تیس برس کی مدت میں یہ تحریک "نعرہ انقلاب" اور "بزن" کے شور سے معمور تھی۔ بتدریج اُس میں زیادہ سنجیدگی، تحقیقی انداز ماضی کے مطالعہ کا ذوق و شوق اور آداب فن کا پاس و لحاظ، تعمیری انداز میں اُبھرا ہے۔ اور بظاہر یہ امکان بالکل روشن نظر آتا ہے کہ اس تحریک کے سنجیدہ مزاج، افراد اس تحریک کو بلند ادبی معیار پر پہونچا دیں گے۔ ترقی پسند تحریک نے ظالم و مظلوم کی کشمکش، روایت پرست سماج کی ناانصافیوں اور تعمیری زندگی کی امنگ کو بڑی اہمیت کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔ اس تحریک کی بدولت اردو شاعری میں فن کے بعض نئے تجربے بھی ہوئے ہیں۔ شاعری کو عروض کی بے جا قید و بند سے آزاد کرانے کی تحریک جس کو اصولی حیثیت سے حالی نے تبلیغ کی تھی۔ پچھلے پچاس ساٹھ برس میں ناکامی کے ساتھ ہی بہرحال چل رہی ہے۔ اس سلسلہ میں ترقی پسند تحریک اور آزاد مسلک رکھنے والے شاعروں کے تجربے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ مقررہ ضابطوں اور روایت پرستی کے مسلک سے بغاوت کرنے والا ہر ادیب و شاعر ترقی پسند تحریک، کائنات انسان اور سماج کے مارکسی تصور پر عقیدہ کو بنیادی اہمیت دیتی ہے۔ اور زندگی کے موجودہ نظام میں ضابطہ کے ساتھ ایک خاص معیار کے تحت انقلاب چاہتی ہے۔

جدید اردو شاعری کو غیر زبانوں کے ادبی خزانوں سے بہت کچھ ملا ہے

اس سلسلہ میں غیر زبانوں کے ادبی شاہکاروں کے ترجموں کا ذکر سب سے پہلے آتا ہے بعض ترجمے اس قدر عمدہ ہوتے ہیں کہ ان کی حیثیت مستقل طبعزاد نظموں کی ہے نظم طبا طبائی، اکبر، سرور جہاں آبادی، اقبال، سلیم پانی پتی، نادر کاکوروی، اثر لکھنوی کی خدمات خاص طور پر قابل لحاظ ہیں۔ جدید اردو شاعری نے انگریزی کے علاوہ یوروپ کی دوسری زبانوں اور سنسکرت اور ہندی سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اور بڑی خوش اسلوبی سے مختلف اثرات کو اردو کے فکر و فن میں جذب کیا ہے۔ اردو شاعری کو ہندی سے قریب تر کرنے کی کوشش کے بہت نتیجہ خیز اثرات پیدا کئے۔ عظمت اللہ خاں کے "سریلے بول" اور آزاد کی "سریلی بانسری" اس سلسلے کے مشہور ادبی کارنامے ہیں۔ اردو میں روز افزوں گیتوں کی تعداد ہندی سے قریب تر ہونے کی کوشش کو خاص طور پر نمایاں کرتی ہے۔

**جدید اردو غزل** — پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ ہیں "غزل ہماری شاعری کی آبرو ہے" دور جدید میں نظم کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن ادب کی دنیا آج بھی غزل کے رمزوں سے معمور ہے حالی نے غزل کے خلاف آواز اٹھا کر ہمارے ادب کی سب سے زیادہ شیریں سب سے زیادہ وجد انگیز اور سب سے زیادہ معنی خیز صنف کو عارضی طور پر مایۂ رسوائی بنا دیا۔ لیکن غزل مرنے کی چیز نہیں ہے۔ بہت جلد غزل نئے ساز و آہنگ کے ساتھ ابھری اور مستقبل کے نہایت روشن امکانات کے ساتھ وہ برابر عروج و فروغ کی راہ پر گامزن ہے۔ نئی غزل نے لفظی مینا گری نادرہ بندی اور زبان کے چٹخارے کے طلسم کو بہت حد تک توڑ دیا ہے۔ رسمی محبت کی داستانیں معدوم ہو گئی ہیں۔ زندگی کے تجربات کا خلوص جذبہ کے

ساتھ فکر انگیز رمز و کنایہ کے لطیف پیرایہ میں بیان و دل کی واردات کا پُر تاثیر انداز میں اظہار یہ ہے۔ وہ میعار جس کی طرف غزل تیزی سے بڑھ رہی ہے جدید دور میں میر، غالب اور مومن کے فکر و فن کے مطالعہ کی طرف خاص توجہ صرف ہوئی ہے۔ اور ان ارباب فن کے جادو بھرے نغموں نے ہمارے دور کے ذہن کو خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ جدید دور جذبہ کی تڑپ اور خیال کی معنی انگیزی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اسی لئے غزل کی رمزیت اور اشاریت خاص مطالعہ کی چیز بن گئی ہے۔ اور اس ذخیرہ میں شاندار اضافہ ہوا ہے۔ شاد۔ حسرت۔ عزیز۔ ثاقب۔ فانی۔ اصغر۔ جگر۔ اثر آرزو۔ فراق اور فیض کے عاشقانہ زمزمہ سنجیوں نے غزل کے مخفی امکانات کو بڑی چابکدستی کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔ فارسی اور اردو ادب میں عشق اور تصوف کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ غزل کے نگارخانہ میں مجاز و حقیقت کی نیرنگیوں کے جلوے بکھرے پڑے ہیں۔ دور جدید میں تصوف نے نکھر کر بالکل نئے نئے طریقوں سے سرمستی کے سامان پیدا کئے ہیں۔ اصغر کا تصوف لطیف روحانی سرشاری کا سامان ہے۔ اقبال نے عشق و سرشاری کے تصورات کو بلند فلسفیانہ زندگی آفریں آہنگ و معنیٰ دیکر غزل کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

## جدید اردو نثر

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو نثر کا سرمایہ بہت کم تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی تصانیف اور کہیں زیادہ ادبی تابش کے ساتھ غالب کے خطوط میں انشاپردازی کے پُرانے اسلوب سے انحراف ملتا ہے۔ اور

آنیوالے زمانے کی ہلکی سی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد صحیح معنی میں اردو نثر پیدا ہوتی ہے۔ سر سید احمد خاں نے ۱۸۷۰ء میں تہذیب الاخلاق جاری کر کے سادہ ادبی نگارش کی تحریک کا آغاز کیا۔ سر سید نے استدلال کے زور اور زبان کی بے ساختہ روانی کے ساتھ زندگی کے مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے اور اس طرح وسیع پیمانہ پر ادبی خدمت کے دروازے کھول دیئے۔ نئے زمانہ کا رجحان انگریزی ادب کے اثرات اور اردو کی نمونہ پذیر صلاحیتیں شدومد کے ساتھ وسعت بیان کا تقاضہ کر رہی تھیں۔ سر سید نے ساز چھیڑا ہی تھا کہ خاصی تعداد میں ہم آواز پیدا ہو گئے۔ محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ محسن الملک، ذکاء اللہ۔ اور شبلی نعمانی نے اپنے قلمی اجتہاد سے جدید اردو نثر کی بنیادیں مضبوط کیں۔ اور علم و ادب کے مختلف شعبوں کی تنظیم کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ نثر کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ اور اس کے دامن پر کمال و فکر، ذہن کی نقش آفرینیاں بہار نظر بنتی گئیں۔ تاریخ، سوانح حقیقت، زبان اور تنقید ادب معاشرتی، تمدنی، علمی، مذہبی موضوعات پر مقالات، افسانے اور ادب لطیف، طنز و مزاح بتدریج ادب کے مختلف شعبے ظہور میں آتے گئے۔ اور وہ شاندار ذخیرہ پیدا ہوا جو آج اردو کے لئے باعث افتخار ہے۔ اخبارات و رسائل کی عام اشاعت نے اردو نثر کو ادبی معیار اور کاروباری مقبولیت دینے میں بہت نمایاں حصہ لیا۔ تہذیب الاخلاق اودھ پنچ، انیسویں صدی، دلگداز اور اسی طرح کے دوسرے جرائد و رسائل نے انیسویں صدی میں بڑی زبردست ادبی خدمات انجام دیں۔ بیسویں صدی کے ساتھ یہ دائرہ وسیع ہو گیا۔

جدید اردو نثر کی بنیاد درحقیقت ان علمی مقالات و مضامین سے

پڑی جو سرسید نے اپنے اصلاحی مشن کے لیے تہذیب الاخلاق میں لکھے۔ سرسید کے قلم کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ انھوں نے مذہب، سیاست، تعلیم اصلاحِ معاشرت و تمدن، غرضیکہ مختلف موضوعات پر فکر و زبان کی ہموار روانی کے ساتھ قلم اُٹھایا۔ اس طرح اردو ادب میں انگریزی کے طرز پر مقالہ نویسی کا آغاز ہوا۔ سرسید کے ساتھیوں میں محسن الملک، ذکاء اللہ، حالی اور آگے چل کر علامہ شبلی نے مقالہ نویسی کے فن کو ادبی حیثیت سے بہت آگے بڑھا دیا۔ اعلیٰ معیار کی صحافت نے بھی اس فن کو تقویت پہنچائی۔ اس راہ میں شرر مرحوم کے "دلگداز" کی خدمات کسی طرح فراموش نہیں کی جا سکتیں۔ مہدی افادی، ظفر علی خاں، سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی نصیر حسین خیال، مولانا ابوالکلام آزاد، اور دوسرے ادیبوں نے مختلف موضوعات پر مقالات لکھ کر اس صنفِ ادب کو مالا مال کر دیا۔

جدید دور میں تاریخ اور سوانح نگاری کے فن نے خاصی ترقی حاصل کر لی ہے۔ قومی احساس کے زندہ رکھنے میں تاریخ کو بڑا دخل ہے۔ غدر کے بعد ہندوستان میں اصلاح و ترقی کی جو تحریک اُٹھی تھی۔ اس نے ماضی کو نئی نظر اور نئے ذوقِ تخلیق کے ساتھ زندہ کیا۔ حالی نے "حیاتِ سعدی" لکھ کر پرانے طرز کی سوانح نگاری پر جس میں بے جا توصیف و تحسین حقیقی شخصیت کو نگاہوں سے چھپا دیتی ہے۔ خطِ تنسیخ پھیر دیا۔ حالی نے "حیاتِ سعدی" کے علاوہ "یادگارِ غالب" اور "حیاتِ جاوید" دو اور مشہور سوانحی تصنیف پیش کیں حیاتِ جاوید نہ صرف حالی کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ بلکہ اردو کے سوانحی ذخیرہ میں خاص مرتبہ و امتیاز کی چیز ہے۔ تاریخی اور سوانحی میدان میں علامہ شبلی نے اعلیٰ ترین کمال حاصل کیا۔ شبلی اردو کے سب سے بڑے مورخ ہیں۔ انھیں قدرت نے تحقیق و جستجو کے نہایت نفیس اور اعلیٰ ذوق سے سرفراز کیا تھا۔ ان کا دائرۂ علم بہت وسیع تھا۔ انھوں نے جو تاریخی تصانیف لکھی ہیں وہ تحقیق کی بلندی و انشا پردازی کے کمال ہر حیثیت سے دنیا کے

بہترین تاریخی ادب میں شمار کیجا سکتی ہیں شبلی کی راہ چلنے والوں میں مولوی عبدالرزاق کانپوری مصنف البرامکہ و نظام الملک طوسی اور سید سلیمان ندوی کو سب سے زیادہ امتیاز حاصل ہوا۔ سید سلیمان ندوی نے "سیرۃ النبی" کی تکمیل کر کے اردو ادب کو ایک ایسی شاندار تاریخی و سوانحی تصنیف عطا کر دی ہے۔ جو اپنے موضوع پر آج کے دور میں شاید سب سے زیادہ بہتر کتاب ہے۔ شبلی مرحوم کی تاریخی و سوانحی تصانیف بھی خاصے ادبی معیار کی چیزیں ہیں اس سلسلے میں دار المصنفین اعظم گڈھ کی خدمات سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ جہاں چالیس برس سے اسلامی تاریخ پر برابر دادِ تحقیق دی جا رہی ہے۔ سوانحی تصانیف میں سید سلیمان کی "حیاتِ شبلی" مولانا ابو الکلام آزاد کا "تذکرہ" عبد الماجد کی "محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق" اور قاضی عبد القادر کی "آثارِ جمال الدین" بلند ادبی وقار سے بہرہ ور ہیں۔

محمد حسین آزاد کی زندہ جاوید تصنیف "آبِ حیات" نے جدید اردو نثر میں تحقیق زبان اور ادبی تنقید کا سنگ بنیاد رکھا۔ آزاد فنِ زبان دانی پر بڑا عبور رکھتے تھے۔ ان کے ذوق تحقیق نے ادب میں ایک نئی راہ کو روشن کیا۔ آزاد ادب کی لطافت اور چاشنی کے بڑے رسیا تھے۔ لیکن تنقید نگار کے لئے جس بے لاگ قلم کی ضرورت ہے وہ آزاد کے پاس نہیں تھا۔ یہ کام حالی نے انجام دیا۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری اور تنقید کی ارتقاء میں عہد آفریں حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے نہایت درجہ صاف گوئی اور بے باکی سے اپنے قائم کئے ہوئے معیار شعر گوئی کی روشنی میں اردو کے ذخیرہ شعر و ادب پر نگاہ ڈالی اور پوری صفائی کے ساتھ اپنے نتائج فکر کو پیش کیا۔ حالی نے اپنی معلومات کی حد تک مغربی تنقید سے کسب فیض کیا اور بڑی فراخدلی اور کشادہ ظرفی کے ساتھ اعلیٰ شعر و ادب اور اصول اور آئین مقرر کئے۔ مقدمۂ شعر و شاعری نے غور و فکر اور اردو کے ذخیرۂ شعر و ادب کی جانچ پڑتال کا ایک

خاصا ذوق پیدا کر دیا۔ اس کے نتیجہ میں مغرب سے صالح ادبی اثرات کو قبول کرنے کا حوصلہ بھی پیدا ہوا۔ اور اپنے ادبی جواہر ریزوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر سطح نمود پر لانے کی تمنا بھی پیدا ہوئی۔ حالی کے قائم کئے ہوئے تنقیدی اصولوں کو شبلی نے زیادہ لطافت و نکھار کے ساتھ پیش کیا۔ اور اُن کی روشنی میں شبلی نے کار تنقید بھی انجام دیا۔ مغربی علم و ادب سے واقفیت بڑھنے کے ساتھ ساتھ تنقید کی نئی راہیں کھلیں۔ مہدی افادی نے بھرپور تاثراتی انداز میں اپنے دور کے نامور ارباب ادب کے ادبی و شعری کارناموں پر اظہار خیال کیا ہے۔ ڈاکٹر بجنوری نے تاثراتی تنقید کی لے کو بہت آگے بڑھا دیا ڈاکٹر عبدالحق نے شعر و ادب کی پرانی کتابوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالنے اور معلومات افزا مقدموں کو شائع کرنے میں نمایاں خدمت انجام دی۔ زبان و ادب کے مبصر و محقق کی حیثیت سے سید سلیمان ندوی کا درجہ بہت بلند ہے۔ ان کی کاوشوں نے بلند معیار علمی تحقیق سے اردو کو مالا مال کر دیا۔ نیاز فتحپوری اور عبدالماجد دریا آبادی نے اپنے اپنے رنگ میں اردو شعر و ادب کے باطنی جمال کو بڑی لطافت کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ نئے حالات کے ساتھ تنقید ادب کا وہ تصور پیدا ہوا جس نے ترقی پسند تحریک کے زیر سایہ پرورش پائی ہے۔ ترقی پسند تصور تنقید نے شعر و ادب کے نفسیات و مزاج کو سمجھنے میں کئی حیثیتوں سے بڑی مدد دی ہے۔ اس سلسلہ میں مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور، اور احتشام حسین رضوی کے نام خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ مغربی ادب کی روح میں یکسر ڈوب کر اردو شاعری کا جائزہ لینے والوں میں ڈاکٹر عبداللطیف اور پروفیسر کلیم الدین احمد خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں افسانے کے بعد سب سے زیادہ توجہ تنقید پر صرف ہو رہی ہے۔

ناول و افسانے ہمارے ادب کی مقبول ترین اصناف میں سے ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے اردو ادب میں قصہ کہانیوں اور داستانوں کا ایک اچھا ذخیرہ پیدا ہو گیا تھا

اس ذخیرہ کی بعض چیزیں بہت جاندار ہیں۔ اور ادب و زندگی کے نقطۂ نظر سے گہرے مطالعہ کی مستحق ہیں۔ جدید دور میں انگریزی اثرات کے تحت ناول وجود میں آیا۔ اس سلسلہ میں یہ چیزیں خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اردو کے پہلے ناول نگار ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنی کہانیاں خالص وعظ و نصیحت اور اصلاح معاشرت کے لئے لکھی تھیں ڈاکٹر نذیر احمد انگریزی ناول کے فن سے آشنا تھے۔ ان کا مقصد بھی ناول نگاری نہیں تھا۔ ان کی حیثیت ایک واعظ اور مصلح کی تھی۔ لیکن اُن کی کتابوں میں سوسائیٹی کے اتنے جاندار مرقع اور اتنے اعلیٰ معیار کی کردار نگاری ملتی ہے کہ ان کے قصوروں کا شمار ناولوں ہی میں ہوتا ہے۔ ۱۸۷۹ء میں رتن ناتھ سرشار نے فسانۂ آزاد کا آغاز کر کے جدید ناول نگاری کو رواج دیا۔ سرشار کے زور قلم اور جولانئ فکر نے لکھنوی تمدن کی نیرنگیوں کو ہمیشہ کے لئے افسانہ کی دنیا میں زندہ و پائیدار کر دیا۔ سرشار نے ناول کی بیرونی ساخت و ترکیب پر زیادہ توجہ نہیں۔ یہ کام عبدالحلیم شرر نے انجام دیا۔ شرر نے واضح طور پر مربوط و منظم پلاٹ پیش کئے۔ اور سر والٹر سکاٹ سے متاثر ہو کر اردو میں تاریخی ناول نگاروں کا آغاز کیا۔ مرزا ہادی رسوا نے ناول کو شور و ہنگامے کے میدان میں سے علیحدہ کر کے زندگی کی سچی مرقع کشی اور ستھری نفسیاتی کردار کی نگاری کی اونچی سطح پر پہنچادیا۔ پچھلے پچاس برس میں افسانوی فن نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ حب الوطنی اصلاحِ معاشرت داستانِ حسن و عشق، جاسوسی کرشمے، سیاسی انسانی فکر و ذہن کا نفسیاتی مطالعہ عوامی زندگی کے شب و روز کے مسائل غرض ہمارے افسانوں میں موضوعات کی ایک دنیا اُبھر آئی ہے۔

اس صدی کے آغاز کیساتھ ملک میں سیاسی بیداری کی جو لہر اُٹھی تھی وہ پریم چند کے فن میں ایک زبردست اعجاز بن گئی۔ پریم چند نے افسانہ کو

عوامی زندگی اور عوامی نفسیات کے اتنے دلآویز اور فکر انگیز مرقعے دیئے ہیں۔ کہ بآسانی اس کا جواب ممکن نہیں ہے۔ ہمارے زمانے میں مختصر کہانی کی مقبولیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ مختصر کہانی لکھنے والوں نے ہندوستان کی موجودہ زندگی کی مرقع کشی نئے نئے رخوں سے کی ہے۔ انگریزی، فرانسیسی اور روسی افسانے کے اثرات نے ہمارے افسانوی ادب کو بہت فائدہ پہونچایا ہے۔ شاعری اور تنقید کی طرح افسانہ بھی ترقی پسند تحریک کے دائرہ عمل کی ایک خاص چیز ہے۔ اس تحریک کے اثر سے افسانہ نگاری کے فن کو بڑی قوت ملی ہے۔

پچھلے ستر برس کی مدت میں مذاحیہ ادب نے بھی بہت ترقی کی ہے۔ جدید دور میں طنز و مزاح کا سنگ بنیاد اودھ پنچ نے رکھا۔ اودھ پنچ کی ظرافت ذہن کی چلت پھرت اور ادبی چاشنی کا ایک انوکھا نمونہ تھی۔ اس میں سستی قہقہہ بازی اور پھبتیوں کو کافی دخل تھا۔ سرشار کے خندۂ نشاط انگیز میں ظرافت چنبیلی کے پھولوں کی طرح بکھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مغرب اثرات کو ذہنی احتیاط و سنجیدگی کے ساتھ حسن و دلکشی کے پیکر میں سمو کر میر محفوظ علی نے طنز ظرافت کو ادبی وقار بخش دیا۔ پچھلے تیس برس میں طنز و ظرافت نے نمایاں ادبی انداز میں کمال آفرینی کی ہے۔ فرحت اللہ بیگ پطرس اور رشید احمد صدیقی نے اپنے آپ اسلوب فکر میں گہری ادبی نشریت اور معنی خیز چابک دستی کے ساتھ طنزیہ ادب کی تخلیق کی ہے۔ عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کا فن لطیف انگیز ہنسی کے لئے کافی سامان فراہم کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں کنہیا لال کپور نے طنز کو ذہانت و فکر کے ندرت کے ساتھ سماج کے ظالم طبقوں کی روسیاہی کو بے نقاب کرنے کے لئے بڑی کامیابی سے برتا ہے۔

جدید اردو ادب کو غیر زبانوں کے ادبی، علمی اور فکری شہ پاروں کے ترجمے گراں بہا دولت ملی ہے۔ بعض بعض ترجمے زبان و بیان کی اتنی گہری بصیرت

اور مہارت کے ساتھ ہوئے ہیں۔ کہ ترجموں میں طبعزاد تصنیف کی شان پیدا ہو گئی ہے، ان ترجموں سے نہ صرف اردو کو دوسری زبانوں کی دولتِ فکر و خیال ملی ہے بلکہ زبان و انشاء میں بھی حسن و دلکشی کے نئے نئے خد و خال ابھرے ہیں۔ ترجمے بیشتر انگریزی کتابوں سے ہوئے ہیں فرانسیسی، جرمنی، ہندی، عربی اور بنگالی وغیرہ سے بھی کافی فیض حاصل کیا گیا ہے۔ ترجمے کے سلسلے میں سید علی بلگرامی عزیز مرزا، ظفر علی خاں، عبدالماجد، عنایت اللہ دہلوی، اور ڈاکٹر سید عابد حسین کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

اوپر کی سطروں میں ہم نے بہت اختصار کے ساتھ اور بہت سرسری طور پر ۱۸۵۷ء کے بعد سے آج تک اردو ادب کی رفتارِ ترقی پر تبصرہ کیا ہے۔ ذیل میں ہم جدید اردو ادب کے ممتاز شاعروں اور نثاروں کے ادبی کارناموں پر اختصار کے ساتھ تبصرہ کریں گے۔ سہولت کی خاطر ہم نے اس حصہ کو ذیل کے عنوانات پر تقسیم کر دیا ہے۔

۱۔ جدید اردو ادب کے معمار۔ اس عنوان کے تحت ہم نے سرسید۔ آزاد۔ حالی ذکاء اللہ۔ نذیر احمد اور شبلی نعمانی کے ادبی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔

۲۔ جدید اردو شاعری۔

(الف) اردو نظم۔ اس عنوان کے تحت جدید دور کے ممتاز نظم گو شعراء کے کمالات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

(ب) اردو غزل گو۔ یہ عنوان ممتاز غزل گو شعراء کے رنگ تغزل پر تبصرہ کے لئے سرنامہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۳۔ جدید اردو نثر۔ جدید دور کے ممتاز نثاروں کی ادبی تخلیق کے جائزہ کے لئے ہم نے چار ذیلی عنوانات منتخب کر لئے ہیں۔

۱۔ ناول و افسانہ ۲۔ انشائیہ مقالات، صحافت، ۳۔ تحقیق و تنقید

(۴) طنز و مزاح۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ تمام ممتاز شعرا اور نثار اس فہرست میں نہیں آسکے ہیں لیکن ایک مختصر سی تاریخ میں اس سے زیادہ گنجائش ممکن بھی نہیں تھی۔

# جدید اردو ادب کے معمار

**سر سید احمد خاں** — جدید اردو ادب کے محسنوں میں سب سے پہلا نام سر سید احمد خاں کا ہے۔ سر سید ۱۸۱۷ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ انکے اجداد کو شاہان مغلیہ کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ عالمگیر ثانی نے انکے دادا کو جوادالدولہ کا خطاب بھی دیا تھا۔ سر سید کے والد میر متقی ایک درویش صفت انسان تھے۔ جب اکبر شاہ ثانی نے انکو عہدہ وزارت دینا چاہا تو انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔ سید صاحب کی پرورش انکی والدہ نے کی جو ایک دیندار اور پاکیزہ طبیعت خاتون تھیں۔ رواج زمانہ کے مطابق انہوں نے عربی فارسی اور علوم دینیہ کی تعلیم حاصل کی اور خاصی دستگاہ پیدا کر لی۔ سر سید کو دہلی کی اس سوسائٹی کو دیکھنے اور اس سے استفادہ کرنے کا پورا موقع ملا جو علم و فن اور شعر و ادب کے اعلی مذاق میں رچی ہوئی تھی۔ سید صاحب کی ملازمت کا آغاز ۱۸۳۸ء سے ہوا جب وہ دہلی میں سررشتہ دار مقرر ہوئے ۱۸۳۹ء میں نائب میر منشی اور ۱۸۴۱ء میں امتحان منصفی پاس کر کے منصف ہو گئے ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۴ء تک دہلی کے صدر امین کے رہے۔ ۱۸۵۵ء میں سید صاحب بجنور منتقل ہو گئے۔ سید صاحب بجنور ہی میں تھے کہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا۔ اسی دوران میں انہوں نے انگریزوں کی مختلف طریقوں

سے مدد کی ملازمت کا یہ دور جہاں ایک طرف سرسید کی اعلیٰ انتظامی قابلیت کو نمایاں کرتا ہے۔ وہیں اسی دور میں انکی علمی تحقیق اور تصنیفی استعداد بھی پورے طور پر روشن ہو جاتی ہے۔ انکی سب سے پہلی کتاب "جام جم" بزبان فارسی ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ ایک تاریخی تصنیف ہے اور خاندان آل تیمور سے متعلق ہے۔ اسکے علاوہ مذہبی اور علمی موضوعات پر رسالے بھی انہوں نے لکھے۔ اس دور کی سب سے معرکۃ الآرا کتاب "آثار الصنادید" ہے جس میں دلی کے مشہور مقامات اور آثار قدیمہ، نیز اپنے زمانے کے تمام کاملین فن فقراء اور علماء کا ذکر کیا ہے اس کتاب کی اتنی شہرت ہوئی کہ انگریزی کے علاوہ فرانسیسی میں بھی اس کا ترجمہ ہو گیا۔ اسکے علاوہ انہوں نے ابوالفضل کی معرکۃ الآرا فارسی تاریخ "آئین اکبری" کی تصحیح بھی کی اور تاریخ فیروز شاہی کو ایڈٹ کیا سرسید کی انتظامی قابلیتوں اور علمی و تصنیفی مشاغل پر نگاہ ڈالنے سے یہ بالکل روشن ہو جاتی ہے کہ وہ بڑے بیدار مغز ذہین، تحقیق و تجسس کا شوق رکھنے والے اور جفاکش انسان تھے ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ انقلاب نے انکی آنکھیں کھول دیں۔ غدر میں انقلاب ہونے کے بجائے بدنظمی بے مقصد شورش اور بعد میں انگریزی سرکار کے کارندوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں پر کھلے بندوں ظلم و جور ہندوستانی شرفا کی تباہی، آن کی آن میں صدیوں کی بنی ہوئی ساکھ کا بگڑ جانا یہ وہ چیزیں تھیں جنہوں نے سرسید کے دل کو شدید ٹھیس لگائی وہ ہرگز اپنی قوم و وطن کی تباہی دیکھنے کیلئے تیار نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انگریز قوم ایک بہتر نظام حیات لے کر آئی ہے۔ اور انکی حکومت کو ختم کرنے کا جذبہ محض جنون ہے۔ ان خیالات نے سرسید کو ایک نئی منزل کے سامنے پیش کیا وہ ایک مصلح کا مقصد لے کر میدان میں آ گئے۔ اور اسکے بعد انہوں نے اپنی ساری زندگی قلم کا سارا زور اور تحقیق کی ساری صلاحیت اور کام کرنے کی ساری اہلیت کو قوم کی اصلاح کے لئے وقف کر دیا۔ انکی رائے میں اہل ہند اور خاص طور پر ان کے دینی بھائی مسلمانوں کی زندگی اور ترقی کیلئے یہ ضروری تھا کہ وہ انگریزی

حکومت کی اطاعت دل سے کریں زمانہ کے مزاج کو سمجھیں۔ نئی تہذیب کو خوش دلی کے ساتھ اپنائیں اور اس زمانے سے سازگار ہو کر کامرانی اور فلاح کی صورت پیدا کریں۔ بحیثیت مصلح سرسید احمد کی زندگی کا آغاز رسالہ "اسباب بغاوت ہند" سے ہوتا ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۵۸ء میں شائع ہوا۔ اس میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی بڑی دلیرانہ کوشش کی گئی ہے غدر کے بعد ملازمت کے دور میں بھی انہوں نے اپنی اصلاحی کوشش کو جاری رکھا۔ سرسید کے خیال میں اصلاح کا پہلا قدم نئی تعلیم حاصل کرنا اور نئے علوم کو اپنی زبان میں منتقل کرنا تھا ۱۸۶۰ء میں جب وہ مراد آباد میں تھے انہوں نے ایک انگریزی اسکول قائم کیا ۱۸۶۲ء میں غازی پور کے قیام کے دوران میں وہاں بھی ایک اسکول کھولا ۱۸۶۴ء میں انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن قائم کی جس کا مقصد یہ تھا کہ نئے علوم کی کتابیں اردو زبان میں شائع کی جائیں اور اس طرح مسلمان مغرب کی ترقی اور خیالات سے آگاہ ہوتے رہیں۔

۱۸۶۴ء میں سرسید کا تبادلہ علی گڑھ ہو گیا۔ اور سوسائٹی کا دفتر بھی علی گڑھ آ گیا یہیں سے ۱۸۶۶ء میں سوسائٹی کا ایک اخبار "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے نام سے نکلا جس میں سرسید خود بھی مختلف مضامین لکھتے تھے اور انگریزی اخباروں سے اچھے اچھے مضامین کے ترجمے شائع کراتے تھے۔

سرسید کے اصلاحی پروگرام کا ایک جز یہ بھی تھا کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک مضبوط قسم کے سماجی روابط قائم کئے جائیں اس غرض کے لیے انہوں کتابوں کا بہت وسیع اور گہرا مطالعہ کیا اور اس مطالعہ کی روشنی میں مسلمانوں کے رائج الوقت مذہبی خیالات کی اصلاح کا کام شروع کیا۔ اس موضوع پر سرسید نے مختلف حیثیتوں سے بہت لکھا ہے ۱۸۶۷ء میں انکا تبادلہ بنارس ہو گیا۔ انکا علمی و تحقیقی ذوق اور اصلاحی جذبہ جہاں کہیں بھی وہ جاتے

تھے زندگی کی کوئی نئی لہر پیدا کرتا تھا۔ یہاں انہوں نے سب سے پہلے ہومیوپیتھی کی حمایت میں ایک ایسوسی ایشن قائم کی اور اسی زمانے میں ایک ہندوستانی یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے گورنر جنرل کو اس مضمون کا ایک میموریل بھیجا ۱۸۶۹ء میں اپنے بیٹے سید محمود کے ساتھ سفر انگلستان کیا۔ سرسید کا یہ سفر اہم تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ لندن میں ایک زبردست کام انہوں نے یہ کیا۔ کہ سر ولیم میور کی مشہور کتاب لائف آف محمد LIFE OF MOHAMMED کا دلیرانہ جواب لکھا اور اسے انگریزی اور اردو میں شائع کرایا۔ یہ جواب ان کے ذوق تحقیق مذہبی سے ان کی سچی لگن اور ان کی طبیعت کی دلیری پر بہت صاف روشنی ڈالتی ہے لندن میں ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ اور کیمبرج کے طرز کا ایک کالج ہندوستان میں کھولا جائے۔ کیونکہ وہ اس خیال پر جم گئے تھے۔ کہ مغرب کے اعلیٰ علوم کو پورے طور پر حاصل کیے بغیر مسلمان ہرگز ترقی نہیں کر سکتے۔ لندن سے واپس آکر ۱۸۷۰ء میں انہوں نے اپنا مشہور رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ "تہذیب الاخلاق" نے اردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ تہذیبی، سماجی، مذہبی، تعلیمی موضوعات پر اس کے مضامین جو نئی فکر اور بالکل نئے اسلوب بیان سے بہرہ ور تھے۔ جدید اردو ادب کا سنگ بنیاد بن گئے ۱۸۷۶ء میں انہوں نے پنشن لے لی اور اپنی بقیہ زندگی کالج کی خدمت میں صرف کر دی کالج کی خدمت کے ساتھ ساتھ انہوں نے مسلمانوں کی مذہبی و تہذیبی اصلاح کا کام بھی جاری رکھا اور اس مقصد کے لیے قرآن شریف کی ایک تفسیر لکھی جو نامکمل رہ گئی قدامت پسندوں نے ان کے ہر خیال اور ہر کام پر پھبتیاں کسی تھیں اور ان سے مخالفت کی تھی۔ تفسیر قرآن کے معاملے میں سرسید کو اسی برتاؤ سے سابقہ پڑا مگر سرسید ہمت کے دھنی تھے۔ ان میں چٹان کا سا عزم تھا وہ آخری دم تک مخالفوں کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں لگے رہے ۱۸۹۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

سرسید کے احسانات — ہندوستان کے چوٹی کے مصلحوں اور ریفارمروں میں سرسید احمد کا بہت ممتاز مقام ہے۔ ان کے بروقت عزم و عمل نے مسلمانوں کو تباہی سے بچا لیا۔ انہوں نے مسلسل تبلیغ سے مسلماں کے اندر فکر و خیال کی آزادی پیدا کی، نئے علوم اور نئے زمانے کو اپنانے کا حقیقی جذبہ ابھارا اور اس طرح ملکی زندگی پر بہت صحت مند اور نفع بخش اثر ڈالا۔ اصلاحی کارناموں سے قطع اردو زبان و ادب پر ان کا مستقل احسان ہے جو ہمیشہ دنیا کیلئے اہمیت رکھتا رہے گا۔

سرسید نے وہ شکنجے توڑ ڈالے جو ادب کو رسم پرستی اور تصنعات میں جکڑے ہوئے تھے۔ انکی کوششوں سے فطری خیال کے سوتے پھوٹ پڑے اور دامن اردو بہار بن کر لہلہا اٹھا۔ انکی جادو بھری شخصیت نے اعلیٰ تخلیقی صلاحیت رکھنے والے روشن خیال افراد کی ایک جماعت پیدا کر دی۔ حالی، شبلی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، محسن الملک، چراغ علی، وقار الملک، ادبی اور قومی زندگی میں چراغ راہ بن جانے والے یہ افراد سرسید کے دامن فیض کے پروردہ تھے۔ بجا طور پر ناقدین فن نے سرسید کو "فادر آف ماڈرن اردو پروز" (بابائے نثر جدید) کے لقب سے یاد کیا ہے۔

سرسید کی تصنیفوں اور تالیفوں کی تعداد پچاس کے قریب ہے۔ آثار الصنادید، خطبات احمدیہ، تفسیر القرآن، مجموعہ لکچر و مضامین ادبی حیثیت سے خاص مطالعے کے مستحق ہیں اور اردو میں سرسید پہلے شخص ہیں جنہوں نے اردو نثر کو مختلف النوع مسائل و مضامین مثلاً تاریخی، تحقیقی، مذہبی، تعلیمی وغیرہ کیلئے خاص طور پر استعمال کیا۔ انکی عبارت صاف ستھری اور واضح ہوتی ہے اور ادائے مطالب میں پوری قدرت کا اظہار کرتی ہے۔ ہر ایک بات کا سرسید کے یہاں

گذر نہیں۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں۔ استدلال کے ساتھ لکھتے ہیں بڑے مقصد کے ساتھ لکھتے اور یوں سچائی اور بیباکی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ یہ چیزیں مل جل کر عبارت میں متانت اور وقار کی ایک شان پیدا کر دیتی ہیں۔ جہاں کہیں طبیعت پر کوئی خاص کیفیت طاری ہو گئی ہے اور تاثرات میں ڈوب کر لکھا ہے قلم میں معصومے کے موقلم کی شان جھلک پڑی ہے۔ سرسید کی تحریروں نے علمی نثر نگاری کی باقاعدہ بنیاد رکھی۔

# محمد حسین آزاد

جدید اردو ادب کے بانیوں میں محمد حسین آزاد کا مرتبہ بہت بلند ہے زمانے کی نئی روشنی کو پہچان کر اس کے مطابق اردو ادب کی اصلاح کیلئے آزاد نے سب سے پہلے قدم اٹھایا۔ وہ دہلی میں ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید محمد باقر دہلی کے معززین شہر میں سے تھے۔ استاد ذوق سے ان کا گہرا یارانہ تھا۔ اسی لئے آزاد کی ابتدائی تربیت ذوق کے زیر سایہ ہوئی ذوق کی صحبتوں میں آزاد کو فن شعر کا علم حاصل ہوا اور ان کا مذاق شعر کو نکھرا انھوں نے پرانے دلی کالج میں بھی تعلیم حاصل کی آزاد کو فطرت نے ایک بہت تحقیق پسند لطیف نفاست طلب اور تیکھی رنگینیوں میں رچا ہوا ذوق دیا تھا دلی کی ادبی صحبتوں اور دلی کالج کے علمی ماحول میں اس ذوق کو بڑی شائستہ تربیت ہوئی فارسی زبان آزاد کا اوڑھنا بچھونا تھی اور زندگی بھر ان کا خیال شیراز و اصفہان کی موج لطافت میں ڈوبا رہا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر نے آزاد کو بھی دلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ پھرتے لاہور پہنچے۔ سررشتہ تعلیم میں پندرہ روپے ماہانہ پر ملازم ہو گئے۔ بہت جلد انکی قابلیت کا ایسا شہرہ ہوا کہ پورے صوبہ پر ان کی علمی دھاک بیٹھ گئی۔ گورنمنٹ نے ان سے

ریڈریں لکھوائیں - اتالیق پنجاب اور پنجاب میگزین کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہے - آخر میں گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی فارسی کے پروفیسر مقرر ہو گئے تھے - انہوں نے دوبار ایران کا سفر کیا - ایران کے سفر سے انہیں تحقیق زبان کے کاموں میں بڑی مدد ملی - ۱۸۷۴ء میں انہوں نے انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ایک نئے طرز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں مقرر کیے ہوئے عنوانات پر شاعروں نے نظمیں کہیں اور اس طرح اردو شاعری میں ایک نئی راہ نکلی انتقال سے بیس برس پہلے آثار جنوں طاری ہونے لگے ادبی کام ان سے بالکل چھوٹ گیا - اسی حالت میں ۱۹۱۰ء میں اس دنیا کے فانی کو خیرباد کہا -

( آزاد کی جودت فکر نے نظم و نثر دونوں کو یکساں سیراب کیا ہے - ان کا امتیاز ترین ادبی وصف انکی انشا پردازی ہے جو لطافت فکر اور لطافت بیان و زبان کا ایسا بدیع امتزاج ہے کہ ذوق سلیم بے اختیار وجد کر اٹھتا ہے - آزاد کے خیال کی راہیں رنگ و رنگت میں ڈوبی ہوئی ہیں - سرشاری اور مستی ان کا ساز دل سے وجد و طرب کے ترانے ابل رہے ہیں یہ ہے آزاد کا رنگ انشا لفظوں کی چاپ پر تال، زبان کے آب و رنگ کی پرکھ آزاد کے خاص شوق کی چیزیں تھیں آزاد کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے زباندانی کے جوہر کو انشا کی رعنائی میں تحلیل کر دیا ہے - آزاد کا سب سے بڑا نثری کارنامہ انکی زندۂ جاوید تصنیف "آب حیات" ہے یہ اردو شاعری اور اردو شاعری کے ارتقاء کا پہلا تذکرہ ہے جو باقاعدہ ترتیب کے ساتھ لکھا گیا ہے "آب حیات" میں اردو زبان کی پیدائش اور عہد ترقی پر اظہار خیال کر کے آزاد نے لسانی تحقیق کا ایک باب کھولا ہے شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کے ارتقاء کو پانچ دوروں میں تقسیم کر کے ہر دور کے مزاج و خصوصیت

کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاعروں کے خیالات، انکی سیرت، کہانیاں اور انکی شاعری پر تبصرہ مختصر یہ کہ آب حیات معلومات اور تنقیدی جائزہ کا ایک گراں بہا ذخیرہ ہے۔ آب حیات میں کمزوریاں بھی بہت ہیں۔ اردو زبان کی ابتدا کا سراغ آزاد نے ناقص معلومات اور کہیں کہیں غیر مستند روایتوں کی بنیاد پر لگایا ہے۔ شاعروں کے حالات میں بھی ذوق فساد سازی خوب کھیل کھیلا ہے۔

آزاد دو ٹوک بات کہنا نہیں جانتے تھے۔ انکے یہاں خار بھی وجہ رونق گل ہے۔ اور شام کی سیاہی بھی سلونے پن کی شبیہ۔ اسی لئے بحیثیت تنقید نگار آزاد کی راہیں اکثر و بیشتر مروت کی زخم خوردہ ہیں۔

زبان و ادب کے محققوں اور نقادوں نے آب حیات پر لے دے کی لیکن آب حیات کی تاریخی اور شرف اولیت سے انکار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ نئے طرز کی تذکرہ نگاری کے میدان میں آزاد کا قدم پہلا قدم تھا۔ یہ چیز بھی نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ کہ آزاد کے زمانے دور قدیم کے متعلق بہت سے شواہد نظر سے اوجھل تھے۔ پرانے تذکروں کے مطالعے اور بزرگوں سے سنی سنائی باتوں کو جمع کرکے باقاعدگی اور ترتیب کی لڑی میں پرو دینا آج آسان کام معلوم ہو لیکن آزاد کے زمانے میں یہ اتنا آسان نہیں تھا۔ آب حیات کے وہ حصے بے انتہا دلچسپ ہیں جہاں شاعروں کی سیرت اور مختلف شعری و ادبی فضاؤں کی، ایسی زندہ عکاسی کی گئی ہے کہ زندگی بموج مستی رقص کناں معلوم ہوتی ہے۔ آزاد کے قلم کے جادو نے اس زندگی کو لفظوں کے دامن میں محفوظ کر دیا۔ "نیرنگ خیال" بھی ایک خاص ندرت کی حامل ہے۔ اس کتاب میں آزاد نے بڑی لطافت اور فن کی چابک دستی

کیسا ALLEGORY کو اردو میں ادبی پیکر عطا کیا ہے۔ جذبات، خیالات اور غیر مری اشیا کی اتنی بہتر تخیلی مصوری کی گئی ہے کہ شعریت قدم قدم پر بکھری نظر آتی ہے "دربار اکبری" آزاد کی سوانحی تصنیف ہے اس میں مغل شہنشاہ اعظم اکبر کی زندگی کارنامہ ہائے حیات، مختلف دلچسپیوں، دربار کے احوال اور نورتن کے کوائف کا بڑے دلکش پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ "سخندان فارس" ایک لسانیاتی اور تحقیقی تصنیف ہے ان کے علاوہ آزاد کی اور بھی تصانیف ہیں۔ مثلاً "نگارستان فارس" "سپاس منگ" "جانورستان"، شاعری میں آزاد کے کارنامے ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے انگریزی ادب کے زیر اثر شاعری کو بیجا مبالغہ ضرورت سے زیادہ حسن کاری اور تخیل اور زبان کی بے جا بازاری سے آزاد کر کے فطری خیال آرائی اور فطری اسلوب بیان کے پیکر میں ڈھالا۔ آزاد کی نظمیں خیال کی لطافت اور زبان و بیان کی دلآویزی کا مجموعہ ہیں۔

# الطاف حسین حالی

سرسید کے رفیقوں میں ادبی حیثیت سے خواجہ الطاف حسین حالی سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ حالی ۱۸۳۷ء میں بمقام پانی پت پیدا ہوئے وہ انصاریوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے انکے والد خواجہ ایزد بخش عزت و فاداری کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے۔ حالی ابھی نو برس کا تھا انکے والد کا انتقال ہو گیا۔ اور انکی تعلیم و تربیت کا بار انکے بڑے بھائی اور بہن پر پڑا۔ قرآن شریف ختم کرنے کے بعد انہوں نے عربی کی تحصیل شروع کی ابھی تعلیم سے فراغت نہ کر پائے تھے کہ سترہ برس کی عمر میں انکی مرضی کے خلاف انکی شادی ہو گئی لیکن حالی کے شوق علم کی یہ کیفیت تھی کہ شادی زنجیر پا نہ بن سکی وہ حصول علم کیلئے

پھر ۱۸۵۴ء میں دلی چلے گئے دلی میں انہوں نے عربی ادب، متعلق عروض وغیرہ میں کافی مہارت حاصل کر لی۔ ذوقِ شعر گوئی نے انہیں غالب کی خدمات میں پہنچایا اور اس طرح غالب سے حصولِ فیض کا موقع ملا حالی نے ان کی علمی و ادبی محفلوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کا اثر ایک گہرے نقش کی طرح ان کے دل و دماغ پر قائم ہو گیا۔ دہلی مرحوم پر حالی کی نوحہ خوانی بڑے سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہے ڈیڑھ برس کے بعد وہ اپنے وطن واپس آ گئے۔ تین چار برس کے بعد وہ اپنے وطن واپس آ گئے۔ ۱۸۵۶ء میں کلکٹری حصار میں ایک ملازمت کر لی مگر غدر کے ہنگامے کی وجہ سے پھر اپنے وطن واپس آ گئے۔ تین چار برس کے بعد حالی نواب مصطفٰے خان شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے یہاں انکے لڑکوں کے معلم و اتالیق کی حیثیت سے رہنے لگے۔ شیفتہ کی صحبتوں نے ذوقِ شعر گوئی اور بلکہ فہم شعر کو چمکا دیا۔ حالی کی تربیت ذہنی میں غالب اور شیفتہ کا نمایاں ہاتھ ہے۔ شیفتہ کے پاس وہ قریب آٹھ برس رہے۔ اسکے بعد وہ لاہور آئے یہاں انکو گورنمنٹ بک ڈپو میں جگہ مل گئی جسمیں انکو سررشتہ تعلیم کی انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت دیکھنا اور درست کرنا پڑتی تھی۔ اس کام نے حالی کو بہت فائدہ پہنچایا انہیں انگریزی ادب اور مغربی خیالات سے واقف ہونے کا موقع ملا اور وہ ذہن جو غالب و شیفتہ کی تربیت سے جدت، لطافت اور تخیل کی فکر انگریزی کا خاص طور پر گرویدہ ہو چکا تھا۔ اس نئے اثر سے اصلاحی جد و جہد کے لیے بالکل تیار ہو گیا۔ حالی نے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں جدید طریقے پر عمل پیرا ہو کر چار مثنویاں پڑھیں۔ برکھا رت، نشاط امید، مناظرہ رحم و انصاف، حب وطن۔ ان مثنویوں میں خیال کی صداقت جذبے کی انسانی تڑپ اور بیان کی سادگی اور پرتاثیر چاشنی نے مل جل کر ایک بہت ہی دلکش کیفیت پیدا کر دی، ان مثنوی کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ حالی لاہور میں زیادہ

دنوں قیام نہ کر سکے۔ وہ دلی آگئے اور اینگلو عربک کالج میں ٹیچر ہو گئے۔ یہی وہ دور ہے جب سرسید سے انکی ملاقات ہوئی حالی کو گویا مرشد مل گیا۔ اور سرسید کو اپنی مشن کا سب سے بڑا ہاتھ آیا۔ سرسید کے ایماء پر حالی نے اپنا مشہور مسدس "مدوجزر اسلام" لکھا یہ مسدس شاعری کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ انکی بدولت اردو شاعری میں گویا انقلاب آگیا۔ اور اردو نظم کے مخفی امکانات کچھ اس انداز سے روشن ہو گئے کہ ایک دنیا کی نگاہیں اسطرف اٹھ گئیں۔ حالی اپنی نظم و نثر سے تادم آخر سرسید مشن کی خدمت کرتے رہے ۱۹۱۴ء میں حالی کا انتقال ہو گیا۔

حالی کی خدمات نظم و نثر دونوں میدانوں میں یکساں امتیاز رکھتی ہیں انکی حیثیت ایک نئی راہ نکالنے والے کی ہے شاعری میں انہوں نے اسے کہیں زیادہ موثر انداز میں تیز کیا جسے محمد حسین آزاد نے شروع کیا تھا انہوں نے شعرائے قدیم کی راہ کو ترک کیا۔ بندھے ٹکے موضوعات اور اسالیب بیان کو چھوڑا اور فکر کے مجتہدانہ عمل کے ساتھ زمانہ کی ضرورتوں اور مغرب کے ترقی یافتہ معیار ادب کے مطابق شعر گوئی کا فریضہ انجام دیا۔ مغربی علوم اور مغربی تعلیم کے اثر سے نیچرل شاعری کا جو تصور عام ہو رہا تھا۔ حالی نے فنی اجتہاد اور پختگی کے ساتھ اسکے نمونے پیش کر کے دکھائے حالی کے نظموں میں وہ تاثیر ہے جو سچی انسانی تڑپ اور محبت سے پیدا ہوتی ہے حالی کو قوم اور وطن سے دلی محبت ہے اور یہ محبت انکے تمام جذبات پر چھائی ہوئی ہے۔ اسی محبت نے حالی جیسے خاموش طبیعت و سنجیدہ مزاج انسان کو اصلاح کے میدان میں لا کھڑا کیا۔ حالی کی طبیعت میں وہ سوز و گداز بھی ہے جو منظر عبرت کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے وہ عزم سفر بھی ہے جو منزل کی کشش کو روح عمل بنا کر دل و دماغ میں اتار دیتا ہے۔ حالی کی شاہکاری نظم "مسدس اسلام" انکے پورے ذہن کا آئینہ ہے بغداد، قرطبہ اور دلی کی تباہی کے بیان میں بے اختیار حالی کے آنسو بہہ پڑتے ہیں مسلمانوں کے عروج اور شکست کے کارنامے انہی نے بڑے احساس فکر کے ساتھ سنائے ہیں۔

انکے علمی سیاسی اور تہذیبی زوال و پستی کے اسباب پر بڑی سخت اور کڑی تنقید کی ہے۔ اور زندگی اور ترقی کی منزل کی طرف بڑی دردمندی اور للکار کے ساتھ انکو پکارا ہے۔ حالی کی طبیعت میں خلوص کا جوہر کچھ اس شان سے رچ گیا تھا کہ انکے ایک ایک لفظ سے انکی تابناکی ٹپکی پڑتی ہے۔ حالی نے جو مرثیے لکھے ہیں وہ اردو شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں خصوصاً اپنے استاد غالب، جو مرثیہ انہوں نے لکھ دیا ہے اس میں جذبہ کی وہ دلسوزی اور گہرائی بھی ہے۔ جو اردو ادب میں اپنی نظیر آپ ہے۔ حالی نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل کی آغوش میں کی تھی۔ اور خود انکے الفاظ میں انھیں بھی برسوں ایک خیالی محبوب کی تلاش میں صحرا نوردی کرنا پڑی تھی۔ لیکن دور اول میں بھی حالی کی غزل گوئی عام طرز سے بہت ممتاز ہے۔ اس میں متانت ہے جذبہ کی ہلکی ہلکی آنچ ہے فکر کا ہموار عمل ہے۔ اصلاحی راہ اختیار کرنے کے بعد حالی کی غزل گوئی کا مزاج بھی بدل گیا۔ محبت کی روایتی تصور کی جگہ انسانی ہمدردی نے لے لی۔ اور حالی کے یہاں وہ کیفیت پیدا ہو گئی جو گداز طبیعت رکھنے والے مفکر کے یہاں ہوتی ہے۔

نثر کے میدان میں حالی اعلیٰ معیار کی مجتہدانہ حیثیت رکھتے ہیں انکی تحریروں نے سادہ نگاری کی اس روایت کو مستحکم کر دیا ہے جسے سرسید احمد نے شروع کیا تھا۔ ایک ادیب کی حیثیت سے انکے دو پہلو بہت ممتاز ہیں۔ سوانح نگاری اور تنقید ان کی پہلی سوانح تصنیف "حیات سعدی" ہے۔ جس میں گلستان بوستاں کے مصنف شیخ سعدی شیرازی کی زندگی، کردار اور مزاج فکر و ادب کا بیان نہایت ہی بے تکلف لیکن بڑے موثر ادبی انداز میں کیا گیا ہے "حیات سعدی" اردو ادب میں اپنے طرز کی پہلی کتاب ہے۔ اور یہ کہنا بجا ہے کہ اردو میں سوانح نگاری کا سنگ بنیاد حالی نے رکھا۔ "یادگار غالب" کی دو حیثیتیں ہیں وہ ایک سوانح تصنیف بھی ہے اور ایک زبردست تنقیدی کارنامہ بھی ہے، حالی نے غالب کی شاعرانہ عظمت کو سمجھانے

ہیں جو لطیف نکتے پیش کئے ہیں وہ انکے اعلیٰ فہم شعری اور نفسیاتی بصیرت پر دلالت کرتے ہیں۔ "حیات جاوید" انکی سب سے ضخیم سوانح تصنیف ہے اس کتاب میں انہوں نے اپنے مرشد سرسید احمد خاں کے حالات زندگی اور مختلف النوع کارناموں کا بیان کیا ہے علامہ شبلی نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا "کتاب المناقب ہے اور وہ بھی نامکمل تبصرہ بالکل سطحی نہیں ہے لیکن اسمیں تنقید کا عنصر کم ضرور ہے لیکن یہ بھی اپنی جگہ واقعہ ہے کہ "حیات جاوید" اور اردو کی سب سے زیادہ معرکۃ الآرا سوانح تصنیف ہے حالی کی تنقید نگاری کا کارنامہ انکا "مقدمہ شعر و شاعری" اسکے مطالعے سے بیک وقت دو متضاد نتیجے ابھرتے ہیں (۱) مغربی ادب اور فن تنقید کے متعلق حالی کی ناقص اور سطحی واقفیت ہے (۲) شعر و فن کے بعض بنیادی اہم مسائل کے متعلق حالی کی بصیرت تو یہ ہیں۔ سرسید کی طرح حالی بھی مغرب سے مرعوب تھے۔ اور اس مرعوبیت کی زد میں آکر بعض اوقات انہوں نے مشرقی ادب اور اردو شاعری پر بڑی بیجا تنقید کی ہے۔ مغربی ادب پر حالی کو کوئی عبور نہیں تھا انہوں نے اکثر مغربی نقطۂ نظر کی غلط ترجمانی کی ہے یہ اور اسی قسم کی دوسری کمزوریاں مقدمہ میں بالکل صاف طور پر نمایاں ہیں لیکن اس سے مقدمہ کی تاریخی اہمیت پر کوئی اہم اثر نہیں پڑتا۔۔۔ مقدمہ پہلی تنقیدی تصنیف ہے جسمیں مشرقی شاعری کا بحیثیت مجموعی جائزہ لے کر مستقبل کی ترقی کیلئے اعلیٰ شاعری کے واضح اصول اور معیار مقرر کئے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں حالی نے اردو شاعری کے مختلف اصناف پر جو تبصرہ کیا ہے وہ بہت جاندار ہے۔ شاعری اور زندگی کے ربط پر بھی حالی کی ژرف نگاہی قابل لحاظ ہے۔ حالی بہت بے لاگ طبیعت رکھنے والا آدمی ہے وہ بالکل کھلے ڈلے انداز میں دو ٹوک بات کہتا ہے مروت کی خاطر لگی لپٹی رکھنا اسے نہیں آتا اردو شاعری میں جو زبردست انقلاب ہوا ہے اس میں حالی کے مقدمہ کا بڑا ہاتھ ہے۔

# ذکاء اللہ

ذکاء اللہ ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے رسم زمانہ کے مطابق بچپن میں عربی فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی بارہ برس کے سن میں دہلی کالج میں داخل ہو گئے بچپن سے بڑے ذہین اور حصول علم کے معاملے میں بڑے محنتی اور جفاکش تھے۔ ریاضی سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ ذکاء اللہ کا آغاز ملازمت بحیثیت پروفیسر ریاضی دلی کالج میں ہوا۔ یہاں زیادہ قیام نہیں رہا۔ آگرہ کے کالج میں فارسی اور اردو کے معلم رہے۔ ۱۸۵۵ء میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ ایک برس بعد دہلی رائل اسکول کے مدرس اعلیٰ ہوئے۔ آخر میں میور سنٹرل کالج الہ آباد میں عربی فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ جہاں پندرہ برس بڑے امتیاز کیساتھ کام کر کے پنشن لی اور بقیہ عمر تصنیف و تالیف میں گذار دی۔

ذکاء اللہ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ریاضیات، سائنس، جغرافیہ، تاریخ، سیاسیات انہوں نے مختلف علوم پر وافر مقدار میں لکھا ہے انکی تصانیف کی تعداد ۱۴۰ ہے۔ وہ بڑے ضابطے کے آدمی تھے اور اپنا بیشتر وقت نہایت پابندی کے ساتھ تصنیف و تالیف میں صرف کرتے تھے۔ انکی تصانیف میں ترجمہ کا حصہ زیادہ ہے۔ تاریخ ہندوستان جو دس ضخیم جلدوں میں ختم ہوئی ہے۔ ذکاء اللہ کی سب سے بڑی کتاب ہے ان کی یہ تصنیف قدر کی مستحق ہے ذکاء اللہ نے علمی خدمات کا جتنا وسیع دائرہ اپنے لئے مقرر کیا تھا۔ وہ باعتبار ذہن اس کیلئے موزوں نہیں تھے۔ وہ بڑے محقق تھے نہ بڑے مورخ نہ صاحب طرز انشاء پرداز۔ انکی تحریر میں سادگی اور روانی ضرور ہے۔ لیکن ادبی رس بیشتر

مفقود ہے ادب کی تاریخ میں انکی اہمیت یہ ہے کہ انہوں نے نئے علوم کی اشاعت اور سر سید کی سادہ نگاری تحریک کو تقویت پہونچانے میں بڑی جانفشانی سے کام کیا وہ علی گڑھ تحریک کے بڑے حامی تھے۔ اور انکی قلمی کوششوں سے اس تحریک کو بڑا فائدہ پہونچا۔

## سر سید کے دو ممتاز رفیق

# محسن الملک اور چراغ علی

سر سید کے رفیقوں میں ارباب ادب کے علاوہ جنکا تذکرہ ہم نے عنوانات کے تحت کیا ہے۔ چند اور نام ہیں جو مطالعہ کے مستحق ہیں۔ پہلا نام سر سید کے دست راست نواب محسن الملک کا ہے محسن الملک سر سید کی طرح بہت آزاد خیال انسان تھے انکے مضامین انکی وسیع عالمیت تیز فکری۔ استدلال پسندی اور صاف ستھری سلجھے ہوئے ذہن کا روشن آئینہ ہیں۔ عبارت بہت سلیس اور شگفتہ ہوتی ہے۔ اور کہیں کہیں اس دلکشی میں رنگینی پیدا ہو جاتی ہے وہ بڑے معرکے کے خطیب بھی تھے انکے خطبے، زور بیان، طنز، لطیف جولانی ذہن اور عزم و ہمت کے مرقعے ہیں۔ تہذیب الاخلاق کو محسن الملک کے قلم نے بڑی تقویت پہنچائی انہوں نے علمی مذہبی سیاسی، اور تعلیمی موضوعات پر فکر کی پوری آزادی کے ساتھ بڑے زور دار مضامین لکھے ہیں۔ سر سید کے وہ عاشق و فدائی تھے انکی کوششوں سے علی گڑھ کالج کو بہت فائدہ پہونچا۔ سر سید کے بعد وہ کالج کے سیکریٹری بھی رہے۔

سر سید کے ہاتھوں جس نئی مذہبی فکر اور نئے علم الکلام کی بنیاد پڑی تھی اسکے سب سے بڑے وکیل مولوی چراغ علی تھے۔ انہوں نے انگریزی اور اردو میں مذہبیات پر بہت کچھ لکھا ہے سر سید کی طرح وہ بھی ایک آزاد فکر اور عقلیت پسند آدمی تھے انہوں نے

اسلامی حقائق و مسائل کی عقلی توجیہہ بڑے مدلل انداز میں کی ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے انکی تحریر میں کوئی خاص دلکشی نہیں ہے لیکن انکی یہ خدمت کہ انہوں نے آزاد فکر کی لے کو بہت آگے بڑھایا بہت مستحسن ہے۔

## نذیر احمد

شمس العلماء ڈاکٹر نذیر احمد ۱۸۳۶ء میں بمقام رہڑ ضلع بجنور پیدا ہوئے ابتدائی عربی و فارسی کی تعلیم اپنے گھر میں حاصل کی شوقِ علم کی پیاس بجھانے کیلئے دہلی آئے یہاں کچھ دنوں مکتب میں پڑھتے رہے۔ پھر دلی کالج میں داخلہ ہوگیا۔ انکی قابلیت روزِ اول سے مانندِ شعاعِ مہر روشن تھی دلی کالج کے بہت ہی نامور طلباء میں انکا شمار تھا تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد تلاشِ معاش میں کئی راہیں بدلیں کچھ دنوں گجرات میں مدرس رہے پھر کانپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہو گئے۔ یہ سلسلے عارضی تھے غدر کے بعد وہ الہ آباد کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے۔ یہیں انہوں نے انگریزی زبان سے واقفیت حاصل کی الہ آباد کے دورانِ قیام میں انہیں اپنی قابلیت نمایاں کرنے کا اچھا موقعہ ملا۔ گورنمنٹ اس زمانے میں تعزیراتِ ہند کا ترجمہ کرا رہی تھی۔ نذیر احمد بھی اس کام میں شریک کر لئے گئے انکا کام اعلیٰ حکام نے اس قدر پسند کیا کہ انہیں تحصیلدار بناکر کانپور بھیجدیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ترقی کرکے ڈپٹی کلکٹر ہوگئے۔ اس دور کے تمام نامور ادیبوں کے مقابلے میں نذیر احمد کو دنیوی وجاہت اور معاشی خوشحالی زیادہ حاصل ہوئی۔ انکی قابلیت سے متاثر ہوکر نظام حیدرآباد کی سرکار نے انہیں اپنے یہاں ایک بڑی تنخواہ پر بلالیا۔ حیدرآباد میں انہوں نے بڑی ترقی کی آخر میں پنشن لے کر دہلی آگئے۔ اور تادمِ آخر علمی و ادبی کام اور قوم کے اصلاحی مشاغل میں مصروف رہے۔ ۱۹۱۲ء میں انتقال ہوا۔

ڈاکٹر نذیر احمد کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ مذہب اور اصلاحِ معاشرت ان

کے سب سے زیادہ خاص موضوعات ہیں۔ عربی کے وہ بہت زبردست عالم تھے اور اسلامی علوم پر ان کی نگاہ بہت گہری تھی۔ انہوں نے مختلف حیثیتوں سے ادب کی خدمت کی ہے نذیر احمد کا ایک امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے ترجمے کو ادبی خاصہ چیز بنا دیا۔ ان کی ترجمۂ قرآن دہلی کی بامحاورہ ٹکسالی زبان کا ایک شاندار ادبی کارنامہ ہے تعزیرات ہند کے ترجمے میں انکے اختراعی ذہن کی حیرت انگیز صلاحیتوں کا بہت دلکش ظہور ہوا ہے۔ مشکل سے مشکل اور نازک انگریزی کی قانونی اصطلاحات کا ترجمہ اردو کے ایسے ترشے ہوئے الفاظ میں ہوا ہے گویا وہ صدیوں سے ڈھلے چلے آرہے تھے۔ ان کے زور بیان اعلیٰ عربی دانی اور لسانی طاقت کا مظاہرہ مذہب اور اصلاح معاشرت پر اظہار خیال میں ہوا ہے جو ان کی تصانیف کا سب سے زیادہ پسندیدہ موضوع ہے۔ اور جس سے ان کے طویل خطبات بھرے پڑے ہیں۔ عربی ہمہ دانی کے جوش میں وہ کہیں کہیں بہت ثقیل اور کھٹن الفاظ برت جاتے ہیں۔ کبھی کبھی بات بھی ضرورت سے زیادہ طویل ہو جاتی ہے۔ اور طبیعت الجھنے لگتی ہے۔ لیکن عام حالتوں میں نذیر احمد کی تحریروں میں بلا کی سلاست شگفتگی اور چلبلا پن ہے محاوروں کے استعمال پر انہیں وہ قدرت حاصل تھی جو کسی دوسرے کے حصہ میں نہ آسکی۔

انکا ایک اہم کارنامہ وہ قصے ہیں جو انہوں نے اصلاح معاشرت کیلئے لکھے۔ وہ ناول نگاری کی ٹیکنیک سے واقف نہیں تھے۔ اور نہ انکا مقصد تھا کہ وہ ناولیں لکھیں لیکن غیر شعوری طور پر انکے یہاں دہلی کی معاشرت کا اتنا جاندار اور شگفتہ بیان ملتا ہے اور کرداروں میں نفسیاتی فنکاری کا وہ کمال روشن ہے کہ اسکے یہ قصے ناول ہی کی سرحد میں آتے ہیں کلیم ظاہر دار بیگ، ابن الوقت مبتلا، اصغری، اکبری اور انکا طرح نہ جانے کتنے

کردار ہیں جن کے آئینہ میں نذیر احمد نے دہلی کی معاشرت اور زندگی کے مسائل کو جیتا جاگتا پیش کر دیا ہے نذیر احمد کے قصوں کے بعض حصے اردو کے افسانوی ادب کے اعلیٰ فتوحات میں ہیں۔ نذیر احمد کی اہم تصانیف حسب ذیل ہیں۔ الحقوق والفرائض، ترجمہ قرآن کریم، ترجمہ قانون تعزیرات ہند، ترجمہ قانون شہادت، مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، ابن الوقت، فسانہ مبتلا۔

سرسید کی فیض بخشیوں سے استفادہ کرنے والوں میں علامہ شبلی نعمانی کا علمی وقار سب سے زیادہ بلند ہے۔ وہ حالی، آزاد، نذیر احمد وغیرہ سے عمر میں کافی چھوٹے تھے شبلی نے تصنیف وتحریر کے میدان میں قدم اس وقت رکھا جب ہندوستان ان بزرگوں کے کارناموں سے معمور تھا۔ یہ انکی تحقیقی صلاحیتوں کا کمال تھا کہ چند ہی سالوں میں وہ صف اول میں ممتاز ہو گئے۔ شبلی ۱۸۵۷ء میں بندول ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اسی دور کے مشہور زمانہ عالم مولوی محمد فاروق صاحب چڑیاکوٹی سے عربی کی کتابیں پڑھیں، شوق علم میں وہ رام پور، لکھنؤ، سہارنپور، اور لاہور پہنچے اور وقت کے مستند اساتذہ سے کسب فیض کیا، انیس برس کے سن میں انہوں نے بڑے روحانی ذوق اور سرور کے عالم میں حج بیت اللہ کیا، کسب معاش کی راہ میں کئی تجربے کرنے پڑے کچھ دن امین رہے۔ وکالت بھی کی لیکن شبلی کے ادبی ذوق کو ایسی چیزوں سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے ۱۸۸۲ء میں انہیں علی گڈھ کالج میں فارسی پروفیسری مل گئی۔ علی گڈھ کے قیام سرسید کی فیض رسانی اور پروفیسر آرنلڈ کی صحبتوں نے شبلی کے علمی، ادبی ذوق کو چمکا دیا۔ اور ان کے سامنے جادو بیاں ادبی خدمات کی راہیں کھول دیں علی گڈھ میں شبلی کا قیام

قریب سولہ برس رہا۔ یہیں سے انکی قومی شاعری کا آغاز ہوا۔ اور یہیں بیٹھ کر انہوں نے تاریخی تصانیف کے اس سلسلہ کو شروع کیا۔ جو شبلی کے تاج وقار کا سب سے گراں بہا موتی ہے سر سید کے انتقال کے بعد شبلی نے علی گڈھ سے تعلق منقطع کر لیا۔ علی گڈھ کے دوران قیام انہوں نے روم و مصر و شام کا سفر بھی کیا۔ علی گڈھ سے ترک تعلق سے کچھ دنوں کے بعد وہ بسلسلۂ ملازمت چار پانچ برس حیدرآباد رہے۔ ندوۃ العلماء کے معاملات نے انہیں حیدرآباد چھوڑنے اور لکھنؤ میں قیام کرنے پر مجبور کر لیا۔ ندوۃ العلماء ۱۸۹۴ء میں اس غرض سے قائم کیا گیا تھا کہ عربی مدرسوں کیلئے ضرورتِ زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے ایک مفید نصاب تعلیم بنایا جائے۔ شبلی روزِ اول سے ندوہ کے معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ حیدرآباد سے ترک ملازمت کے بعد انہوں نے اپنا سارا وقت ندوۃ العلماء کی اصلاح و ترقی کے لیئے وقف کر دیا۔ شبلی کی ساری تدبیریں خاک میں مل گئیں۔ اس لئے کہ ندوہ قدامت پرست علماء کی زود سازمانی کا اکھاڑا بنا ہوا تھا۔ ندوہ سے بددل ہو کر وہ ۱۹۱۳ء میں اعظم گڈھ چلے گئے اور اس مشہور علمی و دینی ادارہ کی بنیاد رکھی جو دار المصنفین کے نام سے موسوم ہے اور جس نے اپنی چالیس سالہ زندگی میں اسلامی علوم اور اردو زبان کی گراں مایہ خدمت انجام دی ہے۔ ۱۹۱۴ء میں شبلی نے اس دار فانی کو خیرباد کہہ دیا۔

شبلی کی شخصیت میں مختلف النوع حیثیتیں بڑے حسین امتزاج کے ساتھ جمع ہو گئی ہیں۔ وہ محقق، مورخ، نقادِ فن، عالم دین، شاعر، مصلح، واعظ غرض حیرت انگیز مجموعۂ کمالات تھے۔ سر سید، آزاد، حالی، اور دوسرے معاصر نے اپنے ذوق کے مطابق تہذیبات، سائنس، تعلیم، تاریخ، تحقیق و تنقید، زبان و ادب، سوانح نگاری اور شاعری میں جو راہیں نکالی تھیں۔ شبلی نے ان کے اندر اپنی عظیم شخصیت کے لافانی نقوش قائم کر دیئے۔ وہ عربی

کے بڑے متبحر عالم تھے۔ فارسی سے خیال بن کر ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھی تحقیق کا ان میں زبردست مادہ تھا۔ انکی بلند فطرت نے مغربی مرعوبیت کے طلسم کو توڑ دیا۔ اور انہوں نے جذبۂ افتخار کے ساتھ مسلمانوں کی تہذیبی حیات نو کے لیے جدوجہد کی۔

اردو زبان و ادب کے سلسلہ میں شبلی کا دائرہ خدمت بہت وسیع ہے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں صحیح تاریخی ذوق کی بنیاد رکھی اور نہایت مستند اور محققانہ تاریخی تصانیف انتہائی ادبی دلآویزیوں کے ساتھ پیش کیں المامون، الفاروق، سیرت النعمان اس پایہ کی کتابیں ہیں جو تاریخی ادب کے بہترین تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ تنقید ادب کے سلسلہ میں شبلی کی "شعر العجم" اردو ادب میں اپنی نوعیت کی ایک نہایت اہم تصنیف ہے۔ شعر العجم میں شبلی نے شاعری کے اصولوں اور معیار حسن و کمال پر کلام کیا ہے فی الحقیقت شعر العجم فارسی شاعری کی تاریخ ہے شبلی نے شاعری کے ان اصولوں کو جنہیں حالی نے پیش کیا تھا۔ زیادہ وضاحت حسن توازن اور رعنائی خیال و بیان کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ شعر العجم میں تحقیقی غلطیاں بھی ہیں۔ لیکن اس سے شعر العجم کے ادبی وقار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ موازنۂ انیس و دبیر شبلی کا ایک دوسرا تنقیدی کارنامہ ہے۔ اور ان کے اعلیٰ ذوق شعر فہمی کا نمونہ ہے۔ شبلی نے علمی و ادبی، تہذیبی اور تمدنی مسائل پر جو مضامین لکھے ہیں۔ وہ جوہر تحقیق اور حسن انشا سے مالا مال ہیں۔ مذہبیات میں انہوں نے سرسید کی فکر کو سجل، نرم اور شگفتہ بنا کر پیش کیا ہے۔ جدید الکلام کی بنیاد رکھنے والوں میں شبلی کی حیثیت بہت بلند ہے۔ انکی آخری تصنیف "سیرۃ النبیؐ" ہے جو ان کے ہاتھوں مکمل نہ ہو سکی یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ کتاب شبلی کے ہاتھوں پوری ہو جاتی تو یہ انسانی زندگی کا سب سے زیادہ عظیم الشان کارنامہ ہوتا۔ شبلی کی تحریروں میں وقار، تمکنت، شگفتگی، رعنائی خیال کا جزاد لکش

امتزاج ملتا ہے وہ نہ آزاد کی طرح رنگ و نکہت میں اس قدر ڈوب جاتے ہیں کہ رنگ و نکہت ہی حاصل نظر بن کر رہ جائے اور نہ حالی کی طرح رنگ و نکہت سے بے نیاز گزر جاتے ہیں۔ وہ ایک ایک لفظ تول تول کر لکھتے ہیں۔ اور بڑے ریاض سے حسن بیان کا نگار خانہ بناتے ہیں۔ شبلی کے اسلوب بیان نے اردو زبان کو ادبیت کا حقیقی جوہر بخشا ہے۔

شبلی ایک بلند نظر شاعر بھی تھے۔ ان کی فارسی غزلیں تغزل کے اعلےٰ ترین کیف کی حامل ہیں۔ شبلی کا اردو کلام ان کی قومی نظموں پر مشتمل ہے۔ ان میں ایک باہمت خود دار اور سچی دینی تڑپ رکھنے والے مرد مومن کے نعرۂ زندگی کی گونج ملتی ہے۔ شبلی کا شاعرانہ طنز زہر میں بجھی تلوار سے کم اثر نہیں رکھتا۔ سرکار پرستوں پر جو نظمیں انہوں نے لکھی ہیں وہ لطیف ادبی طنز کا بہت عمدہ نمونہ ہیں۔

# جدید اردو شاعری نظم

## اکبر الہ آبادی

آزاد اور حالی کے بعد جدید اردو نظم میں سب سے پہلا نام اکبر الہ آبادی کا ہے۔ انھوں نے ایک نیا رنگ پیدا کیا اور ایک نئی راہ نکالی۔ اکبر ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مکتب اور سرکاری اسکولوں میں پائی ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد وکالت کا امتحان پاس کیا۔ اور قریب قریب آٹھ برس وکالت کرتے رہے ۔ ۱۸۸۰ء میں منصف مقرر ہو گئے۔ بتدریج ترقی کرتے ہوئے

۱۹۰۴ء میں عدالت خفیہ کے جج ہوئے اس عہدے سے پنشن لے کر ملازمت سے کنارہ کش ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں انتقال فرمایا۔

اکبر بڑے پاکیزہ طبیعت۔ صاف دل اور محبت پسند آدمی تھے۔ شاعری کا ان کی فطرت میں ودیعت تھا اور انھوں نے بڑے شوق و ریاض سے اس شوق کو نکھارا تھا۔ اور اس کی تربیت کی تھی۔ انہوں نے بھی شاعری کی ابتدا غزل سے کی اور برسوں معاملات حسن و عشق کے میدان میں حسن نظر حسن خیال اور حسن بیان کے جادو جگاتے رہے۔ طبیعت میں روحانی مذاق کی گرمی اور تڑپ تھی۔ اور عمر کے ساتھ اس ذوق کو پختگی حاصل ہوتی گئی۔ اکبر کی غزلیات فنی چابکدستی اور شعری لطافت کا حسین مرقع ہیں۔ لیکن ان کی لازوال شہرت کا دارومدار ان کے طنز و ظرافت کے کلام پر ہے۔ جس نے اکبر کو امام الفن کی حیثیت بخش دی ہے اکبر کا طنزیہ کلام کیا باعتبار فکر اور باعتبار فن بہر جہت گہرے مطالعہ کا مستحق ہے۔ اکبر کے دور میں مشرق و مغرب کے درمیان جو تہذیبی تصادم ہوا تھا۔ اس میں وہ مشرق کے حامی تھے مغربی افکار کا سیلاب ان کے خیالات میں مشرق کی تباہی کا پیام تھا۔ مغرب کے سائینس، فلسفہ علوم ہر شے میں انھیں مادیت کی کارفرمائی نظر آتی تھی۔ جو مشرق کے روحانی جوہر کی قاتل تھی تہذیبوں کو سمونے اور ان کے جاندار اور توانا اجزا کو باہم گر جذب کر کے نئی تہذیبی اور تمدنی قدریں قائم کرنے کیلئے جس مفکرانہ بلند خیالی کی ضرورت ہے اکبر اس سے محروم تھے۔ اگر سید اور حالی پر یہ اعتراض کیا جائے کہ وہ مغرب پرستی کی رو میں ضرورت سے زیادہ آگے نکل گئے تھے۔ تو اکبر بھی مورد الزام ہیں کہ وہ خالص جذباتی قسم کی مشرق پرستی کا شکار ہو گئے۔

اکبر کو حکیم مصلح، فلسفہ کے بلند آہنگ القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ مخلصانہ بھی لیکن یہ

سراسر نیاز مندی کی باتیں ہیں اکبر کی حقیقی حیثیت ایک افکار کی ہے۔ وہ بڑے ذہین، تیز نظر، حیت طبیعت اور شگفتہ مزاج صاحب فن تھے۔ مغرب کے بڑھتے ہوئے تہذیبی سیلاب نے ان کی مشرقیت کو ٹھیس لگائی۔ درد کرب جذباتی تحلیل کی پیچ پیچ راہوں سے گذر کر قہقہوں کے روپ میں ڈھل گیا۔ ایک کامیاب طنزیہ فقرہ سنجیدہ دکالت کے ہزاروں جملوں پر بھاری ہو جاتا ہے۔ اکبر کا شعری طنز، مغرب پسندوں کے خلاف سب سے زیادہ کارگر حربہ سمجھا گیا۔ اسے زبردست مقبولیت حاصل ہوئی، ہنسی ہنسی میں اکبر نے مغربی تہذیب اور نئی اصلاحی تحریک کو مایہ تمسخر بنا رکھ دیا۔ اکبر کا فن ایک اونچے معیار کی آنچ اور اجتہادی شان رکھتا ہے۔ انہوں نے اکبری زبان و بیان کا ایک نیا آئین بنا دیا۔ تمثیلوں کی ایک دنیا آبادی کر دی۔ فن کو سماجی اصلاح کے لئے جیسی موثر انداز میں اکبر نے برتا ہے وہ کم لوگوں سے ہو سکا ہے۔ سید ،جمن، بدھو، ڈاس اکبر کی یہاں منفرد انسان نہیں اخیال کے مختلف دھاروں کے چلتے پھرتے پیکر ہیں۔ اکبر کی ظرافت زبان اور خیال دونوں کے عمل سے پیدا ہوئی ہے۔ چست فقرے، برمحل قہقہے کمزوریوں کی برملا مصوری، اکبر کے یہاں معمولی پھبتی سے لے کر دل کی انتہائی گہرائیوں میں پیوست ہو جانے والے نشتروں تک سبھی کچھ ملتا ہے۔ اکبر سے پہلے اردو میں طنز و مزاح کا جو سرمایہ ملتا ہے وہ بالکل ناقابل لحاظ نہیں ہے۔ سوداؔ کی ہجویات بعض حیثیتوں سے بہت اہم ہیں انشاء کے تمسخر میں بھی رونق مجلس کا اچھا سامان ملتا ہے اکبر کا کمال یہ ہے کہ اس نے بالکل نئی راہوں میں اپنے ذہن کے زبردست تخلیقی عمل سے اس فن کو برتا اور اسے ایک عظیم الشان فن بنا دیا۔

اکبر اس گروپ کے بڑے ممتاز رکن تھے جو سرسید اور علی گڑھ تحریک کے خلاف صف آرا تھا۔ اس کا سب سے بڑا مرکز لکھنؤ

اور سب سے زیادہ دلیر ترجمان اودھ پنچ تھا۔ اکبر کی جولانی طبع نے اودھ پنچ کی ساکھ بڑھادی نا انصافی ہوگی اگر صاف طور پر نہ کہا جائے کہ مشرق و مغرب کے درمیان خوشگوار توازن اور اعتدال کے لئے زمین ہموار کرنیوالے عناصر میں اکبر کے فن کو بہت بڑا دخل ہے، انہوں نے بیجا مغرب پرستی کی رو کو کمزور کر دیا اور دماغوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔

# اسمٰعیل میرٹھی

میرٹھ میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے سولہ سال کی عمر میں سررشتہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۸۸ء میں سنٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہو گئے۔ جہاں بارہ برس قیام کر کے ۱۸۹۸ء میں پنشن لی۔ پنشن کے بعد اپنے وطن چلے آئے اور تادم آخر تالیف و تصنیف میں لگے رہے ان کا سال انتقال ۱۹۱۷ء ہے اسمٰعیل میرٹھی کا نام جدید اردو ادب کے سلسلے میں ہر بچہ کی زبان پر آجاتا ہے۔ ان کی درسی ریڈریں بہت مشہور رہی ہیں۔ اسمٰعیل مرحوم بچوں اور طالب علموں کی نفسیات پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ اسی لئے انکی ریڈروں میں مقبولیت اور دلکشی کا وافر سامان موجود ہے۔ ان کی اس خدمت سے اردو زبان کی عمومی ترویج و اشاعت کو بڑا فائدہ پہنچا۔

نثر کی طرح شاعری میں سادگی ان کا نمایاں وصف ہے! وہ فن کے استاد تھے۔ اور جدید رنگ زمانہ سے آشنا طرز جدید اور طرز قدیم دونوں پر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے اور بڑے ہمہ گیر انداز میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے۔ مولوی صاحب کی طبیعت میں ذوق بھی تھا۔ اور اخلاقیات سے انہیں بڑی گہری دلچسپی تھی۔ اخلاقی موضوعات پر ان کی نظمیں بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز ہیں۔

انکی شاعری کا ایک حصہ بچوں کیلئے مخصوص ہے۔ انکی خوبی یہ ہے کہ مطالعہ سے صحیح زبان کا تصور بڑی دلآویزی کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتا ہے اور اسکا مقصد اخلاقی نتائج بڑے دلنشین انداز میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ غزلوں میں انہوں نے استاد غالب کی پیروی کرنیکی کوشش کی ہے اور جو کچھ کہا ہے بڑے ستھرے انداز میں کہا ہے۔ معاشرت تمدن اور سیاست کے مسائل پر بھی مولانا کی نگاہ تھی اور ان موضوعات پر بھی ان کے کلام میں دلچسپ چیزیں ملتی ہیں۔ قلعۂ آگرہ کے متعلق انکی ایک مشہور نظم ہے اسمیں انہوں نے مسلمانوں کی ترقی کی داستان بڑے موثر انداز میں سنائی ہے اور آئندہ ترقی کے راستے بتائے ہیں۔

اسمٰعیل میرٹھی فطرتاً معلم تھے اور ان کی یہ حیثیت ہر جگہ بہت نمایاں ہے۔ ان کی کتابوں اور شاعری کے مطالعہ سے زبان کے گُر اور قلم کی ہنرمندی کے آداب بڑی اچھی طرح سمجھ میں آجاتے ہیں۔ اسمٰعیل میرٹھی نے سرسید آزاد اور حالی کی اصلاح ادب کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچائی۔

# نظم طباطبائی

سید علی حیدر نام نظم تخلص تھا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے عربی و فارسی علوم بڑے ذوق اور ریاض سے حاصل کئے۔ علمیت اور ہمہ دانی کا ایسا شہرہ ہوا کہ نواب واجد علی شاہ نے مٹیا برج بلا کر شہزادوں کا اتالیق مقرر کر دیا۔ واجد علی شاہ کے انتقال کے بعد نظم نظام کالج حیدر آباد میں پروفیسر ہو کر گئے۔ اور تقریباً بیس سال اس کالج میں رہے۔ کالج سے سبکدوشی ہونے کے بعد آپ ولیعہد کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ اور یہ فریضہ بڑی حسن وخوبی سے انجام دیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قائم ہونے پر نظم دارالترجمہ میں شامل کئے گئے۔ اور ناظر ادبی کی حیثیت سے اپنے علمی فیضان سے دارالترجمہ کو سیراب کرتے رہے سنہ ۱۹۳۳ء ۲۳ مئی

کو نظم کا شیرازہ بکھرتی گیا اور وادیٔ شعر و سخن کا یہ رسیا رہرو راہِ عدم ہو گیا۔

نظم اعلیٰ درجہ کی قوتِ شعر گوئی سے بہرہ ور تھے۔ ان کا علمی تجربہ بڑے پایہ کا تھا۔ انہوں نے دورِ قدیم کی گود میں آنکھ کھولی پرانے ماحول میں تعلیم و تربیت پائی لیکن یہ انکی زمانہ شناسی تھی اور بصیرت کا روشن ثبوت ہے کہ انہوں نے انگریزی ادب اور خیالات کو سمجھنے کی کوشش کی اور جدید قسم کی نظم نگاری سے نئے طرز سخنوری سے قیمتی فائدہ پہونچایا۔ نظم کا نام اردو ادب میں ٹامس گرے کی مشہور نظم "ایلجی" کے ترجمہ سے امر ہو گیا۔ نظم نے گرے کی "ایلجی" کا ترجمہ "گورِ غریباں" کے نام سے کیا ہے۔ اس نظم کا کمال یہ ہے کہ اس میں انگریزی شاعری کے خیالات کو خالص اردو کے تہذیبی اور ادبی ماحول میں شاعرانہ فنی اور تاثیر کلام کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ گورِ غریباں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر انگریزی نظم کی بیرونی ساخت (FORM) کا صحیح چربہ اتارا گیا ہے گورِ غریباں ترجمہ کی حیثیت سے ایک بلند آئیڈیل کی شان رکھتی ہے نظم نے مختلف موضوعات پر دادِ سخن دی ہے علمیت قوتِ نظم شاعرانہ فن کا ثبوت ہر جگہ صاف نظر آتا ہے۔ قصیدے بڑے جدت سے کہے ہیں نظم کے ساقی نامہ کو بھی بڑی شہرت ہوئی غزل کے میدان میں بھی رواں گو سیر کرائی ہے لیکن یہاں پر اکھڑے ہوئے پیر نظر آتے ہیں۔ انکی حقیقی حیثیت ایک نظم گو شاعر کی تھی اور اس حیثیت سے وہ بہت بلند تھے۔

## سرور جہاں آبادی

جدید طرز کے سخنوروں میں منشی درگا سہائے سرور کی شاعرانہ جذبات بڑے قدر و اعزاز کی مستحق ہیں۔ سرور حسن توازن اور اعتدال نظر کے ساتھ جدید رنگ کو اپنایا۔ اسی لئے ان کے کلام قدیم او جدید رنگ کی خوبیاں بڑے سلیقہ کے ساتھ سمو گئی ہیں۔ ۱۸۷۳ء میں جہاں آباد

ضلع بہلی بجنیت میں پیدا ہوئے شاعرانہ ذوق ماں کے پیٹ سے لے کر آئے تھے کم شاعر ایسے ہوئے ہیں جو تمام تر شعریت میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ سرور کے تمام افعال و اقوال حرکات و سکنات گہری شاعرانہ کیفیت کے حامل تھے بڑے آزاد اور رند طبیعت کے آدمی تھے۔ تعصب تنگ خیالی اور پست ہمتی کا ان کے قریب کہیں گزر بھی نہیں تھا۔ ظاہرداری اور غائش سے گریزاں تھے۔ ایسے سچے رند تھے کہ عیب بھی ہنر بن کر چمکتا تھا۔ شراب کے بڑے رسیا تھے۔ اور اسی کی موج مستی میں نقد جان لٹا بیٹھے ۱۹۱۰ء میں انتقال ہوا اسوقت عمر صرف ۳۷ سال تھی۔

سرور کی شاعری اس دور کا آئینہ ہے جب شعر و ادب کی پرانی قدریں ٹوٹ رہی تھیں اور فکر و خیال کی نئی طرحیں پڑ رہی تھیں اس عبوری دور میں بہت سے شاعر اور ادیب تعصب اور فارد آزادمنشی کے سبب حقیقی جادہ سے بہت دور جا پڑے۔ سرور کا کمال یہ ہے کہ نہ وہ طرز قدیم سے لپٹے رہے اور نہ جدید کی رو میں خس و خاشاک بن کر بہے۔ سرور سچے حسن پرست تھے۔ ان کے دل میں ہمہ گیر محبت کی حقیقی تڑپ تھی اور ان کے مزاج میں مستی و سرشاری کی والہانہ کیفیت تھی۔ ان کے کلام میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اس لئے ان کا کلام جذبات نگاری کا بہت جاندار مرقع ہے۔ ان کی ایک اہم خصوصیت حب الوطنی ہے۔ ان کی وطن پرستی اعلیٰ انسانی تصور کی ترجمان ہے اور اس میں تنگی نگاہ اور سب حب وطن کے سچے جوش اور اعلیٰ خیالات سے بہرہ ور ہیں۔ سرور کی تاریخی اور مذہبی نظمیں شاعرانہ خوبیوں سے قطع نظر اس لحاظ سے بڑی قدر و عزت کی مستحق ہیں۔ کہ انہوں نے ہندوؤں کے تاریخی واقعات اور مذہبی تصورات کو سخنوری کے اعلیٰ کمال کے ساتھ جامۂ شعر پہنایا ہے۔ اسی سلسلے میں انکا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندو تلمیحات کو بڑی

مشاقی فن کے ساتھ اردو میں کھپایا ہے۔ سرور کی ذہانت اور شاعرانہ صلاحیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے انگریزی کا محدود علم رکھتے ہوئے بھی انگریزی نظموں کے بڑی فنکاری کے ساتھ آزاد ترجمے کئے ہیں۔ حسین کلام ان کا جوہر تھا اور ہر رنگ کھلا گیا ہے۔

# چکبست

پنڈت برج نرائن چکبست کشمیری برہمنوں کے ایک ممتاز خاندان میں بمقام فیض آباد ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کا وطن تھا پہلے انکی پرورش ہوئی ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی۔ اے پاس کیا اور ۱۹۰۸ء میں قانون کی ڈگری لی چکبست بڑے ذہین، دراک طبیعت، مستعد اور خوش اخلاق انسان تھے۔ انہیں صفات کی بدولت انہیں بہت جلد پیشۂ وکالت میں عروج حاصل ہو گیا۔ اور انکا شمار صف اول کے وکلا میں ہونے لگا ان کے ذہنی اور ادبی کمالات کا سکہ اہل نظر کے دلوں میں بیٹھ گیا تھا۔ اور ملک و قوم نے انکی ذات کے ساتھ بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں لیکن نظام قدرت میں کسے دخل ۱۲ جنوری ۱۹۲۶ء کو جب انکی زندگی کا آفتاب پورے نقطۂ عروج پر تھا موت کی ابدی تاریکیوں نے اسے ہمیشہ کے لئے نگاہ سے روپوش کر دیا۔ اور اردو زبان ایک عالی ظرف محسن رمز شناس ترجمان اور باحوصلہ فنکار سے محروم ہو گئی۔

چکبست کو قدرت نے ایک لطیف نکھرا ہوا ذوق دیا تھا۔ ان کی طبیعت میں غضب کی نفاست اور بلند پروازی تھی۔ توازن اور اعتدال ان کے مزاج کا جوہر تھا۔ وہ سنجیدگی اور متانت لئے ہوئے۔ آزاد خیالی کے قائل تھے۔ وطن کی ترقی اور خوشحالی کے وہ دل سے خواہاں تھے۔ اور بیداری وطن کے ترانوں میں انھیں روحانی سرور ملتا تھا۔

ہندوستان کے قدیم تہذیبی اور ادبی سرمایہ پر وہ جان چھڑکتے تھے۔ اور فکر امروز میں یاد ماضی سے بے نیاز ہو جانا انھیں گوارا نہیں تھا۔ شاعری کا انھیں بچپن سے شوق تھا۔ انہوں نے پہلی غزل نو برس کے سن میں کہی چکبست نے قدیم استادوں کے کلام کا بہت گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ انیس آتش اور غالب کے کلام سے وہ بہت متاثر تھے جدید زمانے کے تقاضوں کو انھوں نے بیدار مغزی کے ساتھ سمجھا تھا۔ ان کے یہاں قدیم و جدید کا بہت توازن ملتا ہے۔

چکبست نے جو ادبی روایتیں بنائیں وہ صالح ملکی ادب کے لئے صحیح بنیاد قائم کرتی ہیں۔ چکبست نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ اور نظمیں بھی کہی ہیں ہر ہر جگہ اپنی وطن پرستی سچی محبت اور طبیعت کے حکیمانہ شان کو نمایاں رکھا ہے۔ ان کی نظمیں سیاست، اصلاح معاشرت، مذہبی واقعات، مناظر قدرت غرض زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہیں۔ وہ نظم گوئی کی تکنیک پر بڑی مشاقانہ قدرت رکھتے تھے۔ اور ہر موضوع کو لطافت خیال کے ساتھ شاعری کے پیکر میں ڈھال دیتے تھے۔ ان کے کلام میں بڑی تری اور شادابی ہے۔ مناظر قدرت پر جو نظمیں انہوں نے لکھی ہیں۔ وہ شاعرانہ مصوری کے عمدہ نمونے پیش کرتی ہیں۔ چکبست کی مرثیہ گوئی ادبی حیثیت سے بڑے معرکہ کی چیز ہے انہوں نے قومی لیڈروں کے بھی مرثیے لکھے ہیں۔ اور اپنے احباب کے بھی۔ ہر مرثیہ میں درد و غم کا انداز بالکل جدا ہے۔ جن لوگوں پر چکبست نے مرثیے لکھے ہیں۔ ان کی سیرت اور انفرادی کمالات کو حسن تاثیر کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے۔ مرثیوں کے مطالعہ سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ چکبست حقیقی جذبات کو شاعری کا موضوع بناتے ہیں اور شعر برائے شعر کے قائل نہیں ہیں۔ اردو شاعری پر چکبست نے گہرا اثر چھوڑا ہے۔

انکی بلند حیثیت ابدی طور پر اردو ادب میں قائم ہے۔ ایک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ انکا مطالعہ بہت گہرا تھا۔ اور نظر بہت وسیع۔ انہوں نے جو مضامین لکھے ہیں وہ فکر کی سنجیدگی بیان کے وقار اور استدلال کے زور قوت کا بہت خوشگوار مرقع ہیں۔ مثنوی گلزار نسیم کے سلسلے میں جو بحث چلی تھی۔ اس میں چکبست نے اپنی فن دانی پرانی شاعری کے بھید بھاؤ سے اپنی گہری واقفیت اور پر زور طریقہ بحث کا اعلیٰ ثبوت دیا ہے انکی ادبی تخلیق کے اعتبار سے کم ہے لیکن اسکے وقار میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔

# اقبالؔ

اردو کو بین الاقوامی شہرت دینے والوں میں اقبال کا نام سرفہرست ہے۔ وہ ہمارے دور کے ایک زبردست فلسفی گراں پایہ حکیم اور شاعر تھے اقبال نے ایک پورے دور کا مزاج بنایا ہے۔ ان کے فلسفے نے مشرق کے بنیادی روحانی تصورات کو آج کے علوم کی روشنی میں نئی زندگی اور نئی قوت دی ہے۔ اور ان کے عمل وجہاد کے نظریئے نے اردو ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان آج سے پچاس سال پہلے جو تہذیبی تصادم ہو رہا تھا اقبال کے یہاں وہ فلسفہ کی بلند سطح پر پہونچ گیا اور اس کے نتیجہ میں کچھ مخصوص اقبالی تصورات ابھر آئے جن میں کہیں کہیں مشرق و مغرب ایک وحدت میں سمو گئے ہیں اور کہیں کہیں تضاد اور بڑھ گیا ہے۔ اقبالؔ کا مطالعہ ایک حیثیت سے اس دور کا پورا مطالعہ ہے۔

اقبالؔ ۱۸۷۷ء میں بمقام سیالکوٹ پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی پھر انگریزی اسکول میں داخل ہوئے اپنے ساتھ والوں میں ہمیشہ ممتاز رہے اور برابر انعام

اور اسکالر شپ پاتے رہے۔ بی۔ اے گورنمنٹ کالج لاہور سے اس امتیاز کے ساتھ کیا کہ عربی اور انگریزی میں امتیاز خصوصی حاصل کیا۔ اس کے بعد جب ایم اے کا امتحان دیا تو یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ طالب علمی کے دور میں اقبال پر سب سے گہرا اثر عربی اور فارسی کے مشہور عالم علامہ سید میر حسن اور فلسفہ کے مشہور پروفیسر آرنلڈ کا پڑا۔ میر صاحب نے شعر و شاعری اور ادبیات کے ذوق کو ابھارا اور آرنلڈ صاحب نے فلسفیانہ تجسس کی آگ کو تیز تر کر دیا۔ اس زمانے میں پورا ہندوستان ایک طرف اصلاح و ترقی اور وطن دوستی کے نعروں سے گونج رہا تھا۔ اور دوسری طرف استاد داغ کے عشقیہ ترانے جانِ تمنا بنے ہوئے تھے۔ شاعری کا آغاز اقبال نے بھی غزل گوئی سے کیا اور استاد داغ سے اصلاح بھی لی۔ لیکن بہت جلد ان کی توجہ قومی اور منظریہ شاعری کی طرف مائل ہونے لگی۔ ان کے اندازِ شعر گوئی میں روزِ اول سے اپج اور آپ اپنی راہ نکالنے کا حوصلہ نمایاں تھا۔

تعلیم کے بعد اقبال پہلے اورنٹیل کالج لاہور اور پھر گورنمنٹ کالج میں پروفیسر رہے اس دوران میں ان کے کلام کی مقبولیت برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ اور یہ تبصرہ عام تھا کہ اقبال کے کلام میں فکر و اسلوب کا بیان ان کا نادر اچھوتا پن ہے۔ ہمالہ، نیا شوالہ، اور ترانۂ ہندی اس دور کی بہت کامیاب نظمیں ہیں۔ اقبال نے ان نظموں میں حب الوطنی کے اعلیٰ ترین جذبات کو نمایاں کیا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے یورپ کا سفر کیا۔ یورپ میں ان کا تین برس قیام رہا۔ اس دور میں انہوں نے بڑے انہماک سے مغربی فلسفہ اور تہذیب کا مطالعہ کیا جو کچھ انہوں نے یورپ کی زمین پر دیکھا اس نے انہیں اس نتیجہ پر پہنچا دیا کہ قومیت انسانوں کے درمیان فساد پیدا کرتی ہے۔ اور وہ پائیدار اتحاد کی بنیاد نہیں

بن سکتی ہے اتحاد کے لیے ایسے عقائد کی ضرورت ہے جو کائنات کی وحدت انسانی اخوت اور زندگی کے لامحدود امکانات پر سچا اعتماد پیدا کریں، یہ چیز صرف مذہب سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ مذہب زندگی کے روحانی جوہر کو اصل قرار دیتا ہے اور پورے نظام حیات کو اس کا تابع اور فرمانبردار بنا دیتا ہے۔ مذہب کی کامل ترین صورت انہیں پیغمبر اسلام کی زندگی اور تعلیمات میں نظر آئی۔ یہیں سے ان کے اس فلسفہ کی بنیاد پڑی جس نے آگے چل کر ایک واضح متعین اور پروقار صورت اختیار کرلی۔ یورپ کے دوران قیام میں اقبال نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ ہندوستان واپس ہونے کے بعد انہوں نے لاہور میں پریکٹس شروع کردی لیکن ان کا بیشتر وقت شاعری اور فلسفہ کے لیے وقف رہا۔ انہوں نے نت نئے دلآویز شاعرانہ پیکروں میں زندگی، حوصلہ مندی، ذوق عمل کا پیام دینا شروع کیا اپنے پیام کو عالمگیر کرنے کے لیے انہوں نے فارسی کو وسیلہ اظہار بنایا، اور ۱۹۱۵ء میں ان کی پہلی فارسی مثنوی "اسرار خودی" شائع ہوئی۔ اس کتاب میں اقبال نے اس تصور کو پیش کیا جو ان کے فلسفہ کا سنگ بنیاد ہے، اور جس کو وہ خودی کے نام سے پکارتے ہیں ہر وجود ایک جوہر رکھتا ہے، اور ہر جوہر نمود چاہتا ہے۔ یہی ذوق نمود ذات کی خودی ہے، باقاعدہ ترتیب سے اس میں فاتحانہ شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اقبال کے سارے کلام میں فلسفہ خودی بکھرا ہوا ہے۔ "اسرار خودی" کے بعد اقبال کی توجہ فارسی کی طرف زیادہ ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بہت دنوں کے لیے اردو ان سے قریب قریب چھوٹ گئی۔ اسی دور کا اردو کلام "شکوہ" و "جواب شکوہ" "شمع و شاعر" "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" جیسی ولولہ انگیز نظموں پر مشتمل ہے۔ فارسی میں اقبال کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔

"پیام مشرق"، "زبور عجم" اور "جاوید نامہ" ہر مجموعے میں اقبال کی فکر زیادہ نکھرتی، سنورتی اور پختہ ہوتی گئی۔ یہ اردو کی خوش نصیبی تھی کہ ایک بار پھر وہ اس کی بزم میں آئے اور "بالِ جبریل" جیسا تحفہ لے کر آئے، جو شعریت اور فلسفہ کا اتنا حسین مزاج ہے کہ اس سے بہتر تصور میں نہیں آتا۔ بالِ جبریل کا ماحول فکر کی ان بلندیوں کی دنیا ہے جہاں عقل اور جذبہ ایک دوسرے سے دست و گریباں نہیں رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے میں کھو کر وجدان کا ایک لطیف ترین تجربہ بن جاتے ہیں۔ "بالِ جبریل" میں صرف چند غزلیں ہیں لیکن ان میں اقبال کے مخصوص فلسفیانہ خیالات، جذبہ کی ایسی تڑپ، طبیعت کی ایسی سرشاری اور نگاہ کی ایسی گرمی کے ساتھ ظاہر ہوئے ہیں کہ غزل کے میدان میں بھی اقبال کی راہ سب سے الگ ہو گئی ہے۔ بالِ جبریل کی نظموں میں اقبال کے تمام فلسفیانہ خیالات کا نچوڑ ملتا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ممالک یورپ کے دوسرے سفر کے دوران میں کہا گیا ہے۔ سفر کے تجربات پر فلسفہ نے صیقل کر دی ہے اور شاعری نے انھیں شمشیر برہنہ کا جوہر بنا دیا ہے۔ اسپین کی مسجد قرطبہ میں بیٹھ کر اقبال نے جو نظم لکھی ہے اُسے اقبال کی نظموں کا سرتاج سمجھا جاتا ہے۔ "بالِ جبریل"، کے بعد ضربِ کلیم شائع ہوئی ہے اسے حکیمانہ اقوال کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے "ضربِ کلیم" کے بعد اقبال کا اردو کلام بہت تھوڑا ہے لیکن اس میں بھی ایک پائیدار شہرت کی چیز نکل آئی ہے۔ وہ ہے "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" زندگی کا آخری زمانہ اقبال نے بیماریوں میں گزرا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو انھوں نے اس دنیا کو خیرباد کہا۔

اردو میں کلامِ اقبال کے حسبِ ذیل مجموعے ہیں۔ (۱) بانگِ درا (۲) بالِ جبریل (۳) ضربِ کلیم اس کے علاوہ کچھ چیزیں اردو میں جو "ارمغانِ حجاز" میں شائع ہوئی ہیں۔ اوپر کی

سطروں میں اقبال کے کلام پر کافی تبصرہ ہوگیا ہے۔ اجمالی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال ایک صاحب پیام فلسفی شاعر تھے۔ مادیت کے مقابلے میں وہ روحانیت کے علمبردار تھے لیکن ان کی روحانیت ترک دنیا اور گوشہ نشینی سے عبارت نہیں تھی۔ روحانیت سے ان کی مراد اپنے جوہر وجود کی پہچان اور اُس جوہر کو زیادہ سے زیادہ چمکا دینا ہے۔ تاکہ اس کی حیثیت ابدی ہو جائے۔ اقبال کے یہاں سچی خدا پرستی خودی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی دنیا حوصلہ اور امید کی دنیا ہے۔ مایوسی ان کے مذہب میں کفر ہے۔ بے عملی سے انہیں نفرت ہے۔ ان کا بیشتر خطاب مسلمانوں سے ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا حقیقی خطاب انسانیت سے ہے۔ کلام اقبال کا وہی حصّہ بہتر ہے۔ جہاں اقبال کی صحیح انسانی حیثیت ابھرآئی ہے۔ اقبال نے اردو شاعری کو مغز دیا۔ فلسفیانہ بلند آہنگی دی امیدوں اور حوصلوں کی دنیا دی۔ اور وہ پیام دیا جو زندگی کی لمناب کو ابدیت سے جاملتا ہے۔

# جوش ملیح آبادی

(سال پیدائش ۱۸۹۴ء)

جوش ملیح آبادی شاعر انقلاب کے اردو دنیا میں منفرد و امتیاز اور شہرت کے مالک ہیں۔ شبیر حسن خاں جوش ۱۸۹۴ء میں اودھ کے تاریخی قصبہ ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان بلند علمی اور سپہ گرانہ روایات کا حامل رہا ہے ان کے پردادا فقیر محمد خاں گویا دبستانِ لکھنؤ کے ایک خوش فکر شاعر اور صاحب فن نثار تھے۔ جوش نے خاندانی روایتوں کو اپنے شاعرانہ فن میں انفرادی نمود کمال کے ساتھ نمایاں کیا ہے ان کے فکر و ذہن کی تعمیر میں دبستان لکھنؤ کی شاعرانہ لطافتیں، ٹیگور کے روحانی نغمے اقبال کا فلسفہ خودی اور پیام عمل، اشتراکیت کا مزدوری دوستی اور عالم پسندی غرضیکہ قدیم و جدید فکر و فن کے

بہت سے عوامل سرگرم کار رہے ہیں۔ نئی نسل پر جوش کی شاعری نے بہت گہرا اثر ڈالا ہے۔

جوش کے یہاں جلال بھی ہے اور جمال بھی انہوں نے عشقیہ ترانے بھی گائے ہیں اور انقلابی نظمیں بھی لکھی ہیں ان کی غزلوں میں دل کی سرشاری اور حسن کی لطافت انگیز ہستیاں ملتی ہیں۔ کہیں کہیں دل کی گہری چوٹ بھی نظر آجاتی ہے۔ جوش کی غزل گوئی اچھے معیار کی چیز ہے۔ لیکن ان کا حقیقی کمال شاعری نظم کے میدان میں ظاہر ہوا ہے۔ انھیں الفاظ کے وسیع خزانے پر ماہرانہ تصرف حاصل ہے۔ وہ بہت بجا کر شعر کہتے ہیں۔ نئی نئی اور دلآویز تشبیہات و استعارات کے مشاقانہ صرف سے جوش اپنے کلام میں طلسم خانے آباد کرتے چلے جاتے ہیں ان کے لہجہ میں گھن گرج ہے۔ اسلوب بیان میں کوندتی ہوئی بجلیوں اور امنڈتے ہوئے سیلاب کا عالم ہے۔ جوش کی سیاسی اور انقلابی نظموں میں بڑے لہجہ کی مجاہدانہ للکار ملتی ہے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ مغز و فکر کی تلاش بےکار ہے وہ کاروانِ زندگی کے حدی خواں ہیں۔ فلسفی حیات نہیں ہیں۔ جہالت، غلامی اور مذہبی تنگ نظری کے بند صفتوں کو توڑ کر ترقی و کامرانی کی نئی نئی راہوں پر گامزنی یہ ہے جوش کی شاعرانہ تبلیغ کا ماحصل۔ جوش کی نظم گوئی کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں شعلۂ ہستی شبنم کے خنک قطرہ میں تحلیل ہو کر سایۂ بہار چمن بھی بن جاتا ہے۔ لطافت خیال کی راہوں میں ان کی فکر انگیز دلربائی کے جادو جگاتی ہوئی نمایاں ہوتی ہے۔ جوش کو زبان و بیان پر اعجاز قدرت رہے انکا بیان شوکت و لطافت نے اردو شاعری کو نئی آرائش کے نئے نئے سامان دیئے ہیں۔

نظم گو شاعروں میں اقبال کے بعد جوش کا مرتبہ سب سے بلند ہے انکے کلام

نے موجودہ نسل کے نوجوانوں کی ذہنی تربیت میں نمایاں حصّہ لیا ہے۔ پچھلے پچیس تیس برس کی شاعری میں جوش کے اسلوب فکر اور انداز شعر گوئی کے بہت نمایاں اثرات جھلکتے ہیں۔ انہوں نے رہبرانہ حیثیت سے نئے دور کے نظم گو شعراء اور بالخصوص ترقی پسند شعرا کی تربیت کی ہے۔ روح ادب نقش ونگار شعلۂ و شبنم فکر و نشاط حروف وحکایت آیات و نغمات عرش و فرش سنبل و سلاسل ان کے مشہور مجموعہ ائے کلام ہیں۔

ولادت ۱۸۸۰ء — **سیماب اکبر آبادی** — وفات ۱۹۵۳ء

سیماب اکبر آبادی نے استادانہ حیثیت سے خدمت شعر و ادب کر کے اپنے لئے ایک ممتاز جگہ پیدا کر لی ہے۔ انہوں نے حصول فن پر بڑا ریاض صرف کیا تھا۔ ان کا کلام بقول آتش کے شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا" شاعری فن کے اعلیٰ ترین معیار پر پورا اترتا ہے۔ ان کی طبیعت میں غضب کی روانی تھی۔ اور پر گوئی ان کا ایک خاص وصف تھا۔ بیان کی شوکت، الفاظ کی بندش تشبیہ اور استعارے کی ندرت اور پرکاری کا وہ بہت اہتمام کرتے ہیں۔ اور یہ چیز ان کے کلام میں وزن اور وقار پیدا کر دیتا ہے۔ سیماب نے غزل اور نظم دونوں میدانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ سیماب ایک سچے وطن پرست اور عظمت مشرق کے سچے دلدادہ ہیں ان کے شعری ترانوں میں وطن پرستی کے جذبات اعلیٰ انسانی تصویر میں ڈوب کر ظاہر ہوتے ہیں۔ سیماب وطنیت اور انسانیت کو ایک رشتہ وحدت میں پروتے ہیں اور پاکیزہ اخلاقی تصورات کی روشنی میں اپنے جذبات انسانیت کا اظہار کرتے ہیں انکے یہاں سیاسی رجحان ہے۔ لیکن جوش کی ہما ہمی نہیں ان کی فکر میں سنجیدگی ملتی ہے۔ لطیف نکات وہ بھی پیش

کرتے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے مدمقابل وہ ایک جہانِ نو کی تعمیر کر رہے ہیں۔ سیماب نے اپنی فکر کی راہ ایک واضح شعور کے ماتحت بنائی ہے اور ادبی رنگ آمیزیوں سے اسے باغ و بہار کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ملک کی ادبی فضا میں انکی علمیت اور شخصیت کا بڑا اثر تھا۔ اور ان کے شاگرد بڑی تعداد میں ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

# حفیظؔ جالندھری

ولادت ۱۹۰۰ء

دور جدید کے شاعروں میں حفیظ جالندھری کا امتیاز کئی حیثیتوں سے ناقابل لحاظ ہے انکی یادگار تصنیف "شاہنامۂ اسلام" اردو میں اپنے طرز کی بہت اہم کتاب ہے اسلام کی عظیم اور تابناک تاریخ کو انہوں نے شاہنامہ میں بیان کرکے رواں تسلسل، فکر کی گرمی اور جذبہ کی تڑپ کے ساتھ منظوم کر دیا ہے۔ حفیظ کی یہ خوبی خاص طور پر قابل تعریف ہے کہ انہوں نے تاریخ کی واقعیت کو شعر کی رعنائی کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے ہم آہنگ کر لیا ہے۔ نظموں میں قوم وطن اور انسانیت کی محبت کا سچا درد ملتا ہے۔ ان کے یہاں جذبہ کی تڑپ الفاظ اور بیان کے ترنم میں جادو بنکر جاگ اٹھتی ہے۔ حفیظ کی طبیعت میں موسیقیت کا بہت نتھرا اور رچا ہوا مذاق موجود ہے۔ ان کی نظم لطیف سرشاری کے تاثرات میں ڈوب کر ابھرتی ہے۔ اور اثر و محویت کا ایک سماں باندھ دیتی ہے۔ وہ بڑی لطیف راہوں سے قاری کے دل و دماغ میں گھر کر لیتے ہیں۔ اور پرواز خیال میں اسے ہمسر بنا لیتے ہیں۔ ان کے گیتوں میں بڑا رس اور من موہ لینے والی شان ہے فارسی لطافت کو وہ ہندی ترنم میں بڑی خوبصورتی سے سمو دیتے ہیں۔ حفیظ کی زبان نہایت میٹھی ملائم، دلربا پر اثر ہے۔ جو سادہ بیانی کے قالب میں ڈھل کر ایک موثر شان اختیار

کرلیتی ہے۔ شاہنامہ اسلام اور مجموعہ ہائے نظم کے علاوہ انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ جو کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔

# افسر میرٹھی

ولادت ۱۹۹۸ء

اردو شاعری میں نئے تجربات کرنے والوں میں حامد اللہ افسر میرٹھی کی کوشش بہت قابل لحاظ ہیں۔ انہوں نے رسمی شعر گوئی کی راہ سے انحراف کرکے وطن پرستی کے جذبات اور مناظر قدرت کی طرف خاص توجہ کی۔ وہ بہت سادہ زبان برتتے ہیں اور لطیف روحانی آمیزش کے ساتھ وطن پرستی کے ترانے الاپتے ہیں۔ عروض کے میدان میں بھی انہوں نے کشادگی کی نئی راہ نکالی ہے۔ اور شعر و موسیقی کے وسیع تر معیار پر مروجہ بحروں کی نئی نئی شکلوں کو رواج دینے کی کوشش کی ہے۔ خیال کی شگفتگی زبان کی دلکشی اور شعر کے ترنم میں ان کی خاص توجہ رہتی ہے۔ ان کی بعض نظمیں سادہ اور موثر جذبات نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ مثلاً "دنیا میں جنت میرا وطن ہے" مناظر فطرت سے انہیں گہری دلچسپی ہے۔ ان کی حسن آفرین نظر فطرت کے سادہ سے سادہ منظر میں دلکشی کے پہلو ابھار دیتی ہے۔

# اختر شیرانی

دور جدید کے رومانی شاعر ہیں۔ اختر شیرانی کے دلآویز نغمے موج لطافت بن کر ابھرے اور کیف و سرشاری کی فضا پیدا کر گئے۔ جدت پرست اختر نے خیال کی ایک جنت اختیار کی تھی جہاں دوشیزگی کا نکھار جادو جگاتا تھا۔ اور مست و سرشار شیرانی محبت کے رنگین کیف بار نغمے الاپتا تھا۔ شیرانی کا فن دل کی موج سے ابھرتا ہے۔ اور سرشاری اور سپردگی پر اسکی تان ٹوٹتی ہے۔

شیرانی نے جس موضوع کو بھی لیا ہے حسین تخیل اور لطیف غنائی پیکر میں منتقل کر دیا ہے اس کے اعلیٰ الزبن کلام میں خیال کی لطافت اور لفظوں کا ترنم ایسے دلآویز حسن کے ساتھ سموگئے ہیں۔ کہ ان لطیف شاعرانہ ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ رومانی فن خیال کے بہکنے کی راہیں بہت آسانی سے کھول دیتا ہے، ایسے مقامات پر اختر کے یہاں تکلف اور لفظی میناکاری کے پہلو زیادہ ابھر آتے ہیں۔ غزلوں اور نظموں کے علاوہ اختر کے یہاں گیتوں کا بھی ایک کافی حصہ موجود ہے۔ زبان میں تراش خراش اور نت نئی صنعت گری کا انھیں بھی شوق ہے۔ صبح بہار، نغمۂ حرم، اختر ستان وغیرہ ان کے مشہور مجموعہ ہائے کلام ہیں۔

# ساغر نظامی

سیماب اکبرآبادی کے دبستان شعری سے نمو و کمال حاصل کرنے والوں میں ساغر نظامی کا نام سب سے ممتاز ہے ساغر نے وطنیت کے ترانے جدت پسندی اور دل کی لمک کے ساتھ سنائے ہیں۔ وہ ایک خوش گو، پر گو اور طبیعت دار شاعر ہیں۔ وطنی کلچر کو اپنی شاعری میں سمونے کی انھوں نے کامیاب کوشش کی ہے ہندوؤں کے مذہبی رہنماؤں اور ہندی۔ مشاہیر وطن پر انہوں نے بڑی کامیاب اور موثر نظمیں لکھی ہیں سیماب کی طرح ساغر بھی اسلامیت اور وطنیت کو ایک خوشگوار وحدت میں سموئے رہتے ہیں۔ ساغر کے خیال کی کارفرمائی مختلف النوع موضوعات پر رہتی ہے۔ انکی قوت شعر گوئی لہکتے لہکتے انداز میں ظاہر ہوتی ہے اور ان کے تاثرات کو بعض اوقات بہت حسین خیال آفرینی اور بہت طرح دار اسلوب بیان کے پیکر میں رونما کر دیتی ہے۔ شعری ترنم کی خاطر انہوں نے بھی بحروں میں بعض بڑی خوشگوار جدتیں کی ہیں۔

# چند ممتاز ترقی پسند شاعر

ادبیہ مریم نے غدر کے بعد سے چند زمانہ موجودہ تک کے صاحب امتیاز شعرائے کلام پر فرداً فرداً مختصر تبصرہ کیا ہے یہ کہہ دینا کہ ضروری ہے کہ اس تبصرہ میں تمام ممتاز لوگوں کے نام نہیں آسکتے ہیں۔ دورِ حاضر کی شاعری میں ترقی پسند اسکول نے اپنے لئے ایک خاص جگہ پیدا کر لی ہے ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ ترقی پسند تحریک ادب کے مقاصد اور کارنامے کیا ہیں۔ یہاں ہم اختصار کے ساتھ ان چند شاعروں کے کلام میں تبصرہ کریں گے۔ جنہوں نے ترقی پسند تحریک کے دامن میں تربیت پاکر ملک گیر شہرت حاصل کی ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ حالیؔ کے دور سے ادب اور زندگی کے درمیان واضح تعلق کا تصور شاعروں میں نمایاں ہو چکا تھا۔ اقبالؔ نے اس تصور کو بڑی بلند نظری کے ساتھ اعلیٰ فلسفیانہ حیثیت میں پیش کیا یوں بھی تمام وہ شاعر اور ادیب جنہوں نے ادب اور زندگی کے تعلق کی ایک نئے انداز سے تعبیر کی ہے اور ترقی پسند شاعروں کے کلام میں اس کی بہت واضح تصویر ملتی ہے ہم اس موقع پر چند بہت ممتاز ترقی پسند شاعروں کو تبصرے کیلئے منتخب کئے لیتے ہیں۔ اسرار الحق مجازؔ، معین احسن جذبیؔ، علی سردار جعفری، وامق جونپوری، اور فیض احمد فیضؔ اس تبصرہ سے ترقی پسند شاعری کے مزاج اور ترقی پسند شاعروں کے اندر سخنوری پر قدرے وضاحتی روشنی پڑ جائے گی۔

## اسرار الحق مجاز

مجاز اس ادبی گروپ کے ممتاز فرد ہیں جس نے ۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر اردو ادب میں نئے انداز سے نغمہ سرائی کے سلسلہ کا آغاز کیا۔

مجاز کی طبیعت میں بہت لطیف شعری جوہر موجود ہے۔ اس کے یہاں زندگی کی حوصلہ مندی ہے۔ نگاہ کی مستی ہے۔ قدم کے فاتحانہ انداز ہیں وہ جو کچھ بھی کہتا ہے طبیعت کی سرشاری کے ساتھ کہتا ہے۔ اس لئے اس کا شاعرانہ فن تبلیغ اور پروپیگنڈے سے مجروح نہیں ہونے پایا مجاز نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ اور غزلیں بھی۔ اس کے یہاں فن کا وہ رچاؤ زبان کی وہ چاشنی، فکر کی وہ گھلاوٹ اور جذبہ کی وہ سرشاری موجود ہے۔ جو غزل گو نگاہ خاص کی چیز بنادیتی ہے۔ مجاز کی نظموں میں ہمت و مردانگی کا ایک خوشگوار آہنگ ہے۔

**معین احسن جذبی** ـــــ جذبی ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوتے ہوئے بھی اس پر گامزن نہ ہوتے انکی طبیعت میں ایک خاص گداز اور فکر میں محو ہو جانے والی کیفیت ہے سماج کا ظلم اور سرمایہ دارانہ نظام کی ناانصافیاں جذبی کے یہاں سوزِ دل میں ڈوبی ہوئی زیادہ بن کر ابھرتی ہیں۔ ان کے جذبات میں بغاوت کی جو آگ ہے وہ بھڑکتی کم ہے سلگتی زیادہ ہے۔ جذبی فن کا بہت زیادہ ستھرا مذاق رکھتے ہیں۔ ایک مسلک سے متعلق ہونے کے باوصف ان کی انفرادیت شعوری احساس کے ساتھ نمایاں رہتی ہے وہ کم کہتے ہیں۔ لیکن جو کچھ کہتے ہیں۔ گہری فکر میں ڈوب کر کہتے ہیں۔

**علی سردار جعفری** ـ علی سردار عملی سیاست کے مرد میدان ہیں۔ بڑے ذہین صاحب تدبیر اچھے مقرر اور بڑے دل و جگر کے آدمی ہیں۔ انہوں نے بڑی صفائی کے ساتھ اور بہت کھلے ہوئے انداز میں مارکسی نظریہ ادب کی توضیح کی ہے۔ اور اپنے کلام میں ترقی پسند انداز شعرگوئی کے بعض ممتاز عناصر کو بڑی خوبی اور فنی حوصلہ مندی کے ساتھ نمایاں کیا ہے جعفری یہاں خطیبانہ بلند آہنگی ملتی ہے جس نے جوش کو شاعر انقلاب بنا دیا ہے۔ نعرۂ انقلاب جعفری کے یہاں مردودستانہ کے پیکر میں نہیں ڈھلتے خونِ زندگی کو تیز سے

تیز تر کرنے والے دو جز میں ظاہر ہوتا ہے۔ جعفری شاعری کی رمزیت اور اشاریت کے کچھ زیادہ موافق معلوم نہیں ہوتے وہ بات کو کھل کر کہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ترقی پسند ادب ابھی ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے مستقبل بتائے گا ادب میں جعفری کی رجزیہ للکار زیادہ دیرپا اثر رکھتی ہے یا مجاز کا انگاروں میں لپٹا ہوا نعرہ رستاخیز۔

**وامق جونپوری** — وامق کی شاعری ترقی پسند ادب کے تصورات کی بڑے حسین انداز میں ترجمانی کرتی ہے۔ وامق کی طبیعت میں اعلیٰ درجہ کی موسیقیت ہے اور وہ بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ اپنے مقصد کو ایک سلجھے ہوئے مربوط فکری پیکر میں غنائی دلکشی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ وامق نے آزاد اور پابند دونوں قسم کی نظمیں لکھی ہیں اور غزلوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی مربوط اور غنائی طبیعت کی کارفرمائی ہر جگہ یکساں نظر آتی ہے۔ اور ان کے سیاسی مقاصد بھی ہر جگہ بالکل واضح رہتے ہیں۔

**فیض احمد فیض** — فیض احمد فیض کو ترقی پسند شاعری میں روز بروز ایک خاص فوقیت اور برتری حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ اگر فیض کی فکر یوں ہی ارتقا کے مدارج طے کرتی رہی تو وہ بہت جلد ترقی پسند تحریک کے میر کارواں بنے ہوئے نظر آئیں گے۔ فیض کے یہاں فکر و گفتار کا ایک بلند انفرادی انداز ہے فکر و جذب کو وہ اتنی لطافت سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔ اور فن کے بلیغ حسن کاری کے ساتھ ایسے مجمل پیکر میں پیش کرتے ہیں کہ جو خیال کی گہرائیوں میں ایک جنبش سی محسوس ہوتی ہے ایسا کلام جو حقیقی لطف کے لئے فکر مزید کی دعوت دیتا ہو بڑے اونچے درجے کا کلام ہوتا ہے اور فیض کے یہاں ایسے اجزا ملتے ہیں جو کلام کے اس معیار پر پورے اترتے ہیں فیض بات کو بہت بھرپور انداز میں پیش کرنے کا بہت ماہرانہ سلیقہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام میں فلسفیت کی ایک جھلک ملتی ہے۔

سنہ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے زندگی کے نئے نئے ماحول میں نئے طرز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ یہ جدت تاریخ ادب میں ایک طویل انقلابی عمل کی تمہید بن گئی۔ حالی نے اسے واضح اصلاحی مقصدات سے آشنا کیا۔ چکبست، سرور، اقبال، آزاد اور جوش کے یہاں یہ مقصدیت زیادہ وسیع تر، زیادہ ابھر اور زندگی کے حالات و مسائل سے زیادہ مربوط ہوتی گئی۔ حصول آزادی سے پہلے اس کا مطمح نظر تھا۔ سامراج سے جنگ، فکری، روحانی سیاسی حریت، مشرقیت اور ہندیت کے نوجیون کی جدوجہد۔ آزادی کے بعد حالات سے پیدا ہونے والی مایوسی جھلاہٹ، انگاروں سے بجھی ہوئی تنقید سے قطع نظر اس کے سامنے ہے، مستقبل کی تعمیر کا ذوق و شوق۔ اس منزل کی تلاش جو جنگ آزادی کے دور میں جنت تصور بنی ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں ان شاعروں کے علاوہ جنکا ہم نے مختصر ذکر کیا ہے۔ آنند نرائن ملا، شفیق جونپوری، جاں نثار اختر، جگن ناتھ آزاد، مخدوم محی الدین اور اختر الایمان کے نام خاص توجہ کے مستحق ہیں۔

# اردو غزل

## شاد عظیم آبادی

شاد ۱۸۴۶ء میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے ان کی تعلیم و تربیت بڑے علمی ادبی ماحول میں ہوئی۔ تاثر زبان اور فصاحت و بلاغت کے رموز بہت ابتدا سے انکے ذہن پر نقش ہوتے گئے۔ اور خاطر خواہ تربیت اور فطری ظہور استعداد کی بدولت برابر نکھرتے گئے۔ عربی و فارسی کی تحصیل کے بعد شاد نے کچھ دنوں انگریزی بھی

پڑی لیکن یہ سلسلہ بہت تھوڑے عرصہ رہا۔ ادبیات اور فنون شاعری کے حصول کیلئے انھوں نے کئی استادوں کے سامنے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ لیکن شعر کا تربیت کی تکمیل سید شاہ الفت حسین فریاد کے ہاتھوں ہوئی۔ جو خواجہ میر درد کے شاگرد تھے شاد کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اسلامی علوم کے علاوہ انہوں نے مسیحی، پارسی اور ہندو مذہبیات کا بھی دراز مطالعہ کیا تھا۔

شاد نے بہت طویل عمر پائی اور ساری عمر شعر و ادب کی خدمت میں صرف کر دی انہوں نے بڑی کامیابی اور مشاقی کے ساتھ خدائے سخن میر اور خواجہ میر درد کی قائم کی ہوئی شعری روایات کی پیروی کی۔ زبان کی سادگی اور صفائی پر وہ خاص توجہ صرف کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں تغزل کی کیفیت اور اثر ہے۔ یہ اثر ذہن کے برجستہ عمل اور زبان کی فکری سلوگی سے پیدا ہوتا ہے۔ شاد کی طبیعت میں غور و فکر کا استغراق بھی تھا۔ اور مذہب کی تڑپ بھی، مذہب کے مطالعہ نے فراخ مشرب محبت کو طبیعت کا جوہر بنا دیا تھا۔ ان کے کلام میں اخلاقی، فلسفیانہ اور عارفانہ پہلو بہت نمایاں ہیں۔

شاد بڑے قادر الکلام شاعر تھے، انھوں نے مختلف اصناف شعر کو پر طبع آزمائی کی ہے۔

لیکن ان کے خاص میدان غزل، اور مرثیہ ہیں۔ مرثیہ میں وہ۔ میر انیس کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ اور انہوں نے خیال و زبان میں وہی لطافت، چاشنی تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کی جو میر انیس کا طرۂ امتیاز ہے۔ غزل میں شاد کے پر اثر نغمے اردو کے شعری گلدستے میں سدا بہار پھول بن گئے ہیں۔

پیدائش ۱۸۷۵ء

وفات ۱۹۵۱ء

# حسرت موہانی

جدید دور میں اردو غزل کو نئی زندگی دینے والوں میں حسرت کا نام سرِفہرست آتا ہے۔ سید فضل الحسن نام تھا۔ ۱۸۷۵ء میں قصبہ موہان ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بی۔ اے علی گڑھ سے پاس کیا۔ شعر و ادب کا ذوق بچپن سے تھا۔ تعلیم نے اس کو نکھار دیا۔ حسرت کی زندگی ایک حسین مجموعۂ اضداد تھی۔ مذہباً وہ پکے مسلمان اور سختی سے پابندِ شریعت تھے۔ روحانی ذوق نے انھیں تصوف کی چاشنی کا گرویدہ بنا دیا۔ سیاست کے میدان میں وہ بغاوت اور انقلاب کے علمبردار تھے۔ انہوں نے جس مجاہدانہ عزم سے دلیری اور پامردی کے ساتھ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا۔ بعض حیثیتوں سے انھیں تمام چوٹی کے لیڈروں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ قوم نے بجا طور پر انھیں رئیس الاحرار کے لقب سے سرفراز کیا۔ ان کی زندگی میں غضب کی سادگی اور درویشانہ مشرقیت تھی۔ خیالات میں وہ انتہا پسند نظریوں سے تمام و کمال ہم آہنگ تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص نے پائیدار سکونِ دل کے ساتھ اتنی متضاد چیزوں کو اپنی ذات میں کیسے جمع کر لیا تھا۔ یہی ان کی شخصیت کا کمال ہے۔ اور اسی میں ان کی انسانی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔

اردو کے قدیم ذخیرۂ ادب کی حسرت کی نگاہ میں بڑی قدر و قیمت تھی۔ برسوں کی ریاضت، محنت اور مطالعے سے انہوں نے اردو شاعری کے ذخیرہ کو کھنگال ڈالا۔ اردو پر ان کا نہ بھولنے والا احسان یہ ہے کہ انہوں نے پرانے شعراء کے کلام کا انتخاب شائع کر کے پرانی شاعری کے مطالعہ کے لئے نئی راہ کھول دی۔ اور نہ جانے کتنے صاحبِ فن کہنے والوں کو سطح

شہرت پر نمایاں کر دیا۔ اردو شاعری پر حسرت کی نظر بہت وسیع اور گہری ہے۔ اور اس حیرت انگیز
مطالعہ نے انکے فطری ذوقِ شعری میں سمو کر ان کی طبع شاعرانہ کو طلسمات بنا دیا ہے۔
وہ تسلیم کے شاگرد اور اس واسطہ سے خاندانِ مومن سے متعلق تھے۔ لیکن وہ
کسی ایک رنگ کے آدمی نہیں تھے۔ "وہ رہرو نہ ارراہ تھے" مختلف استادانِ فن
کے چمن سے انہوں نے یکساں خلوص و محبت کے ساتھ خوشہ چینی کی ہے۔ اس ذوقی
تقلید نے ان کے کلام کے ایک حصّہ کو تصنع اور آورد کی چیز بنا دیا ہے" حسرت
محض مقلد نہیں تھے۔ تقلید کی راہوں سے انہوں نے اعلیٰ معیار کے تخلیق جوہر کو
ہویدا کیا ہے۔ جذبہ کا خلوص اظہار کی بیباک برجستگی شعری ماحول کا لطیف
نکھار اور اسلوب کی جادو بھری پرتاثیر سادگی یہ ہیں حسرت کے فن کے ممتاز
اوصاف انہوں نے غزل کو خیالی مینا کاری بے نتیجہ مبالغہ آرائی اور
ضرورت سے زیادہ ظاہر پرستی سے آزاد کر کے اس کی فطرت کے مطابق
اسے جذباتِ وارداتِ دل اور تصوراتِ کیف و مستی کے اظہار کا موثر
وسیلہ بنا دیا۔ سادگی اور بے ساختگی کی روایت ان کی غزل گوئی کا سب
سے تابناک جوہر ہے دورِ جدید میں حسرت اس روایت کے خالق
اور اس راہ کے امام ہیں۔ وہ سخنِ دل کو دل کی زبان میں پیش کرنے کے
قائل ہیں ان کے کلام میں نہ فلسفہ کی گہری پرچھائیاں ہیں نہ تصوف
کی شدید وجدانی محویت مذہب، تصوف، سیاست شکوۂ احباب،
لذتِ آزار، التفاتِ نگہ یار جو کچھ بھی ہے۔ زندہ و توانا جذبات کی
تڑپ اور سرمستی لئے ہوئے ہیں۔ موجِ غم خندۂ نشاط دونوں
یکساں انکی مستی طبع میں ڈوبے ہوئے ہیں شاعری میں محتاط جذبہ اصلاح کے ساتھ
وہ پیروی میر و مومن پر نازاں تھے۔ غزل ان کا میدان تھا۔ انہوں نے

نظم کے نئے تجربوں کی طرف کبھی توجہ نہ کی۔ اور سیاست میں ڈوبے رہنے کے باوصف کبھی اسے باقاعدہ موضوع شاعری نہ بننے دیا۔

سال پیدائش سنہ ۱۸۶۲ء

## صفی لکھنوی

سال وفات سنہ ۱۹۵۰ء

سید علی نقی صفی کے کلام میں فکر و فن کی ستر سالہ مہارت اور نمود جوہر کی ایک شاندار داستان ملتی ہے صفی بڑے علمی وقار کے آدمی تھے۔ فن پر ان کو مشاقانہ قدرت تھی۔ رنگ قدیم سے پورے طور پر وابستہ رہنے کے ساتھ ان کے یہاں جدید کو اپنانے کی ایک مخلصانہ تمنا بھی تھی۔ شاعری کے مختلف اصناف میں ان کا کلام موجود ہے۔ نعت میں منقبت میں ان کے معرکۃ الآرا قصائد استادانہ مہارتِ فن کا بہت اچھا نمونہ ہیں۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ان کا رجحان قومی اور وطنی شاعری کی طرف بھی ہو گیا۔ اس میدان میں بھی صفی نے جولانی طبع کی بہار خوب دکھائی ہے۔ صفیؔ نے اپنی طولانی نظموں میں بڑی کامیابی کے ساتھ تغزل کا رنگ پیدا کیا ہے ان کی نظموں کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان میں ہندوستان کے اکثر بڑے شہروں کے تاریخی و جغرافیائی حالات اور تہذیبی آثار کو بڑے دلکش انداز میں منظوم کیا گیا ہے۔ صفیؔ نے نئے زمانے کے تصور کو پہچان کر اردو غزل میں اصلاح کے لئے قدم اٹھایا ان کے عاشقانہ کلام میں وہ جلا ملتی ہے۔ جو فن کی مہارت اور ذہن سلیم کے باوقار شعری عمل سے پیدا ہوتی ہے۔

سال پیدائش سنہ ۱۸۸۲ء

## عزیز لکھنوی

سال وفات سنہ ۱۹۳۵ء

اصلاح شعر کی تحریکات کے سلسلہ میں عزیز لکھنوی کا نام خاص اہمیت

رکھتا ہے۔ عزیز لکھنوی ایک ذی علم خاندان سے تعلق رکھتے تھے دینی علوم میں انکی نظر بہت گہری تھی اور مشرقی ادبیات سے ان کو غیر معمولی شغف تھا۔ عزیز نے قدیم دائرہ سخن میں رہتے ہوئے قصیدہ اور غزل کے میدان میں حالی کی اصلاحی تجویزوں کو عملی جامہ پہنایا۔ ایک خاص حیثیت سے بہت ممتاز کوشش کی نئی تعلیم اور نئے زمانے کے اثرات نے میر اور غالب کے عظمتِ فن کو ایک نئے انداز سے اجاگر کیا ہے۔ غدر کے بعد کے بیشتر شاعر میر او غالب کی راہوں کو اپنے اپنے انداز سے اپناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عزیز کے یہاں بھی یہ شعوری کوشش نمایاں ہے پروفیسر عبدالقادر سروری کے الفاظ ہیں۔

"انکی غزل کی بنیاد غالب کے نئے تغزل پر رکھی گئی ہے" عزیز تمام و کمال اپنے آپ کو لکھنؤ کے ماحول سے آزاد نہ کر سکے۔ لیکن انکی یہ خوبی خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ ان کے کلام میں موثر جذبات نگاری اور سادہ بیانی کے وہ عناصر ملتے ہیں جو آگے چل کر ادب کی ایک شاندار روایت بن گئے۔

# ثاقب لکھنوی

غالب کے رنگ فکر کو ثاقب نے قابل لحاظ انفرادیت کے ساتھ اپنے کلام میں بڑی شائستگی اور ادبی وقار کے ساتھ ابھارا ہے۔ ثاقب غالباً نقد شعر کا اچھا ذوق نہیں رکھتے تھے۔ اسی لئے انکے کلام میں پست و بلند اور رطب و یابس سب ایک ساتھ بھرا پڑا ہے منتخب اشعار میں خیالات کو بلند کرنے کی شعوری کوشش بڑے حسین انداز میں نمایاں ہے۔ خودداری اور انفرادیت ہستی کا ثاقب کے یہاں ایک واضح تصور موجود تھا۔ اسی وصف نے انکی غزل گوئی کو ایک امتیاز بخش دیا ہے۔ ثاقب کی قوتِ نظم گوئی بڑے اعلیٰ معیار کی ہے زبان

کو وہ نگاہ کی گہری لطافت اور اعلیٰ معنوی حسین آفرینی کے ساتھ برتتے ہیں۔ حسن و عشق کے لطیف واردات کو ثاقب نے نازک شعری پیکروں میں تحلیل کر دیا ہے۔ اردو غزل کے باطنی جوہر نے دورِ جدید میں نئے رنگ و روپ اور نکھار کے ساتھ راہِ زندگی میں قدم رکھا ہے۔ اسی سلسلہ میں ثاقب کے کلام سے بھی بڑے اچھے شواہد فراہم ہوتے ہیں۔

## فانی بدایونی

پیدائش ۱۸۷۹ء — وفات ۱۹۴۱ء

جدید اردو غزل کو معنوی رفعت دینے والوں میں شوکت علی خان فانیؔ کا نام بہت ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ فانی ۱۸۷۹ء میں قصبہ اسلام نگر ضلع بدایوں میں پیدا ہوئے۔ ۱۳ برس کی عمر تک عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انگریزی شروع کی ۱۹۰۱ء میں بریلی کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ پانچ برس خاموشی کی زندگی گذاری پھر قانون کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے علی گڈھ کالج میں داخل ہو گئے ۱۹۰۸ء میں ایل، ایل، بی کا امتحان پاس کیا۔ عرصہ تک لکھنؤ اور بریلی میں وکالت کرتے رہے۔ فانی کی طبیعت کو وکالت سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ اسی لئے اس پیشے سے انکو نہ کوئی امتیاز حاصل ہوا اور نہ مالی منفعت خاک۔ حیدرآباد کی کشش اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کی توجہ نے انھیں ارضِ دکن پہنچا دیا۔ جہاں وہ تادمِ آخر مقیم رہے۔

فانی کی غزل گوئی سنجیدہ اور نکھرے ہوئے فلسفیانہ مذاق کی آئینہ دار ہے انہوں نے فکر و فن کی پرانی روایتوں کو بلیغ انداز میں آب و رنگ، عطا کیا ہے اور تازگی بخشی ہے زندگی کی مجبوری اور ناسازگار حوادث کی بدولت درد و الم، فانی کی شاعری کا خاص موضوع ہے اردو شاعری میں شکوہ تقدیر، نالہ نارسا کا ماتم اور جفائے محبوب فریاد و فغاں، کی

روحیں بہت مقبول رہی ہیں۔ اس لحاظ سے فانی کے موضوع میں کوئی تازگی نہیں ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فلسفیانہ ذوقِ نظر کے ساتھ اس موضوع پر صرف ذہن کیا ہے۔ اور اپنی شاعری میں نزاکتِ فن کے پورے پاس و لحاظ کے ساتھ خیالات و جذبات کو سطحِ شعور پہ نمایاں کر دیا ہے۔ غالب کے بعد فانی کے یہاں فکرِ شاعرانہ کے فلسفیانہ عمل کا ایک بہت واضح اور انفرادی نمونہ ملتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ غالب کی وسعتِ فکر، فراخ مشربی اور زندگی کے وسیع اور متنوع مظاہر کے فکری تجربے فانی کے یہاں نہیں ملتے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ فانی نے اپنے محدود دائرے میں بلند انفرادی امتیاز پیدا کر لیا ہے فانی زبان و بیان کی آرائش اور جادو کا بہت لطیف تصور رکھتے تھے انھوں نے لطافتِ زبان کی قدیم روایتوں کو حسنِ نظر کے ساتھ اپنی شاعری میں برقرار رکھا ہے ان کے اسلوبِ بیان میں ذوقِ گفتار کی بلیغ حسن آفرینی ملتی ہے فانی کے یہاں ذوقِ نظر کی بلندی ایک ہموار توازن میں قائم رہتی ہے اور وہ مشاقی فن کے ساتھ فکر بیان کو لطافت کے پیکر میں سمو دیتے ہیں فانی شیات کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں نعش و کفن کے مظاہر بکثرت ہیں مجموعی حیثیت سے ان مظاہر کا اثر زیادہ خوشگوار نہیں ہوتا۔ لیکن یہ اپنی جگہ حقیقت ہے کہ فانی کے جذبات و خیالات کی صداقت، آورد و تصنع کے داغ سے بالکل پاک ہے۔ ان کے کلام میں عام طور پر سنجیدہ فکر اور رعنائی بیان کی لطیف آمیزش ملتی ہے۔ متغزلانہ اشعار میں جذبہ کا سوز و گداز گرئ فکر میں اس شانِ بلوغت کے ساتھ تحلیل ہو گیا ہے کہ قیامت کی بشریت ابھر آئی ہے۔

## ریاض اکبر آبادی

ریاض خیر آبادی کا کلام شگفتگی زندہ دل اور لطافتِ زبان و بیان کا ایک حسین مجموعہ ہے ان طبیعت

ہیں غضب کا بانکپن تھا اور فکر کی جاندار ترنگ میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں۔ اور خیال کی شوخی اور زبان کی لطافت سے لطف طبیعت کا ایک عالم پیدا کر دیتے ہیں۔ شراب اور شراب سے متعلق طرب انگیز مضامین کو ریاض نے اپنے لئے خاص کر لیا ہے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انہوں نے کبھی پی نہیں جولانیٔ فکر کے بل پر میکدہ کی نشاط و سرمستی کو اپنی شاعری میں گلزار بنا تا، شیخ و زاہد پر ریاض کی شاعرانہ چوٹیں خندۂ لطیف کا سامان فراہم کرتی ہیں ریاض کو محاوروں پر بلا کی قدرت حاصل ہے الفاظ محاورات کے برمحل صرف سے وہ اپنے کلام میں قیامت کا بانکپن پیدا کر دیتے ہیں۔ ریاض کی دنیا بڑے توانا لیکن حدود میں رہنے والے قہقہوں کی دنیا ہے۔ یاس و الم کا ان کے قریب گزر نہیں۔ مستیوں میں وہ اس قدر ڈوبے ہیں کہ ہوش و نظر سے محروم ہو جائیں۔ ریاض نثر بھی بہت رنگین لکھتے تھے ان کا ریاض الاخبار برسوں ملک کے ادبی حلقوں میں دھوم مچائے رہا۔ ان کا مجموعۂ کلام "ریاض رضوان" کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔

# جلیل مانکپوری

امیر مینائی کی شاعرانہ روایت کو زندہ رکھنے اور لطافت بیان کی نت نئی رنگینیوں سے اس شعری اسلوب کو چمکانے والوں میں استاد جلیل کا نام سرفہرست آتا ہے۔ بیس برس کے سن میں استاد امیر کے شاگرد ہوئے۔ اور امیر کے آخر دم تک دفتر امیر اللغات کے سکریٹری رہے استاد کے ساتھ دکن چلے گئے۔ اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ موجودہ نظام دکن کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔ اور عزت و وقار کے ساتھ زندگی گزاری۔

جلیل نے نہایت صاف ستھری، عام فہم زبان میں حسن و عشق کی واردات کو پیش کیا ہے الفاظ کے ترنم سے کلام میں تاثیر پیدا کرنے کا انہیں بہت اچھا سلیقہ حاصل تھا۔ جذبات عشق اور اظہار الفت ان کا خاص موضوع۔ یوں اخلاق، تصوف اور ناصحانہ

مضامین، سب ہی نظم ہو گئے ہیں۔ جلیل نے کوئی نئی راہ نہیں نکالی۔ حسن نظر سے پرانی راہوں میں خوب خوب گلکاریاں کی ہیں۔ زبان و محاورے کی صحت اور کلام کی سادگی ان کے خاص اوصاف ہیں۔

# اصغر گونڈوی

سال پیدائش ۱۸۸۴ء

سال وفات ۱۹۳۶ء

ذاتی کسب و ریاض اور شوق و محبت سے انسان اپنے ذوق و وجدان کی کتنی ستھری اور پاکیزہ تربیت کر سکتا ہے۔ اصغر کی زندگی میں اس کی ایک بہت روشن مثال ملتی ہے اصغر کو باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔ گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کی کچھ دنوں انگریزی پڑھی لیکن خانگی پریشانیوں کی وجہ سے انٹرنس کا امتحان دے سکے۔ ذاتی مطالعہ کتب بینی اور اپنی خداداد قابلیت سے انہوں نے ایک نہایت شائستہ نکھرا ہوا شعری مذاق اور اچھی بلند نکتہ سنج نظر پیدا کر لی۔ اصغر ایک ضابطہ پسند متین طبیعت، خوش اخلاق اور بہت ستھرے آدمی تھے۔ زندگی میں مذہبیت کی بڑی لطیف شان تھی تصوف کی روحانی سرشاری نے مزاج میں شگفتگی، زندہ دلی اور رنگینی پیدا کر دی تھی۔

جدید اردو غزل میں اصغر ایک اہم امتیاز کے مالک ہیں۔ ان کے کلام میں غزل گوئی کا فن لطافت اور نکھار کے انتہائی سلونے روپ میں ظاہر ہوا اس لحاظ سے اصغر کا کلام ایک خاص بلندی رکھتا ہے۔

اصغر بہت کم گو تھے۔ فکر کے وہ لمحات جب احساسات و واردات موج دل میں ڈوب کر نغمہ کا قالب اختیار کر لیں ان کے یہاں ذرا مشکل سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑے لطیف وجدانی اہتمام کے ساتھ آتے تھے۔ حسین مرغزار میں ماہ انجم کا بارانِ نور اس شان کے ساتھ کہ روح کے دریچے کھل جائیں" ذہن معطر ہو جائے۔ اور زندگی پر ایک باطنی سرشاری کی کیفیت طاری ہو جائے۔ یہ ہے اصغر کا شعری ماحول۔ ان کے کلام میں ایک ایسے بیدار ذہن کا عمل ملتا ہے۔

جو فکر کی لہروں کو وجدان کے ترنم کے ساتھ ہم آہنگ کئے رہتا ہے۔ اصغر کی شاعری بلیغ خیال اور تاثراتی اسلوب کا ایک حسین مجموعہ ہے۔ ان کا ذخیرہ کلام مقدار میں کم ہے۔ لیکن سراپا انتخاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصغر کا طرز ایک حیثیت سے ان پر ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ فکر و زندگی کی بلیغ لطافت قدرت کا عام فیضان نہیں اصغر کے یہاں روحانی نشاط و سرشاری کی ایک کیفیت ملتی ہے۔ جو گھنٹوں فکر کو محو تصور رکھتی ہے۔ رمزیت و اشاریت غزل کے سب سے زیادہ نازک حربے ہیں، اور اصغر نے ان کو بڑی مشاقی فن کے ساتھ برتا ہے۔ اصغر نے جو نثری مضامین لکھے ہیں، ان میں بھی خیال کی لطافت، طبیعت کا حسن انتظام اور اعتدال و وقار کے ساتھ بات کہنے کی کوشش صاف جھلکتی ہے۔ "نشاط روح" اور "سرود زندگی" اصغر کے کلام کے مجموعے ہیں۔

## جگر مراد آبادی

پیدائش سنہ ۱۸۹۰ء — وفات ستمبر سنہ ۱۹۶۰ء

نغمۂ دل، اور لحن دلنواز، قدرت نے جگر کو ان دونوں اوصاف سے بہرہ ور کیا جو عوامی مقبولیت کا جادو جگاتے ہیں۔ جگر نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو شعری نغموں سے معمور تھا۔ ان کے والد مولوی نذیر علی صاحب دیوان شاعر تھے۔ جگر کی ذہنی تربیت میں کتابوں اور مدرسوں کا حصہ بہت کم ہے۔ فیضان صحبت اور فطری نمود جوہر نے ان کی شعری صلاحیتوں کو چمکا کر دوس نظر کر دیا۔ جگر کو داغ اور تسلیم کے تلمذ کا شرف حاصل تھا۔ وہ بڑے رنگین طبیعت، زندہ دل احباب پرست اور شگفتہ مزاج آدمی تھے حسن کی تلاش و طلب اور حضور حسن سرشاری جذبات کا ربط انگیز عالم اور نغمہ آفرین کیفیت، جگر کی زندگی میں

یہ پہلو سب سے زیادہ روشن اور ممتاز نظر آتا ہے۔ مجاز زینۂ حقیقت ہے یہ قول ہمارے مسلمات میں سے ہے۔ جگر نے برسوں مجاز کی سیرگاہوں میں دیدارِ حسن یار کیا ہے اور جوشِ مستی میں بھرپور ترانے الاپے ہیں۔ راہ طلب آگے چل کر حقیقت معنی کے میدان میں ضم ہو گئی ہے اب جگر ہیں اور محویتِ قلب کے وجدانی لطیف سروں میں ڈوبے ہوئے نغمے جگر کی دنیا رنگ و نکہت کی دنیا ہے رقص و نغمہ کی دنیا ہے ایسی کیف و سرشاری کی دنیا ہے۔ جو قمری کی صورت میں صنوبر کی شاخوں پر جھوم جھوم جاتی ہے۔ جگر کے جہانِ فکر میں افسردگی، مایوسی اور دل کی موت کا کہیں گذر نہیں ہے اس کے جذبات ہمہ عالم فاتحانہ ہستی کی موج میں ڈوبے رہتے ہیں یار کی توجہ شبِ فراق میں بھی مانند بن کر ان کی آنکھوں کو پیام راحت پہنچاتی ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ جگر کے یہاں عمیق تر فکر کی ضو فشانی بڑھتی گئی اور نکاتِ لطیف کی فراوانی عام ہو گئی ہے۔ ان کے کلام پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ بعض اوقات وہ اس قدر جذبوں میں ڈوبے رہتے ہیں کہ الفاظ شعر کا مفہوم پیش کرنے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ جگر کے ابتدائی دور کے کلام میں نمایاں خامیاں ملتی ہیں۔ لیکن وقت نے ان سب کو افسانۂ پارینہ بنا دیا جگر نے جس بھرپور وجدانگیز اور نشاط پرور عالم میں سرشاری دل کے ترانے سنائے ہیں۔ وہ انھیں کا حصہ ہیں۔ جگر کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر سروری لکھتے ہیں: "داغ کے بعد ان کے رنگ میں بہت سے شاعروں نے لکھنے کی کوشش کی لیکن وہ تقلید سے آگے نہ بڑھ سکے جگر اسی راستہ پر گامزن ہو کر ایک نئی راہ کھولتے ہیں۔ جو زبان کی حد تک داغ کی سادگی کا نچوڑ ہے۔ لیکن خیالی و فضائی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی مناسبت نہیں۔ جگر کی شاعری عاشقانہ ہوتے ہوئے بھی داغ کے مادی تمنا سے پاک ہے۔ اس میں۔ ایک روحانیت کی جھلک ہے۔"

سال وفات
۱۹۵۲ء

# آرزو لکھنوی

سید انوار حسین آرزو جدید دور کے اربابِ فن میں ایک یادگار امتیاز کے ساتھ مشہور دبستانِ لکھنؤ کی سربرآوردہ شعراء نے اصلاحِ شاعری کی جو کوششیں کیں ان کے سلسلے میں آرزو کے کارنامے بڑی اہمیت رکھتے ہیں - آرزو بہت ستھرا علمی ادبی اور شعری مذاق رکھتے تھے - جلال لکھنوی کے فیض نے انھیں فنِ عروض کی نزاکتوں اور موثر شعر گوئی کے رموز سے بخوبی آشنا کر دیا تھا - آرزو کی ایجاد پسند طبیعت نے حوصلہ مندی کے ساتھ میدانِ شعر گوئی میں قدم رکھا اور بہت جلد ان کی مشاقیٔ فن اہلِ نظر کے نزدیک مسلّم ہو گئی - آرزو نے مختلف اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے - اور جوہرِ زباندانی یہ ہر پہلو خوب خوب نمایاں کیا ہے - غزل کے میدان میں ان کی شعر گوئی کی پوری قوت اور تاثیر ظاہر ہوتی ہے - آرزو کے کلام میں درد و محبت کی ایک طبعی کسک رہتی ہے جو لطیف کیفِ سخن بن کر نمایاں ہو جاتی ہے - آرزو کی زبان نہایت شیریں اور موثر ہوتی ہے نکھرے ہوئے جذبے کہیں کہیں ایسی رواں پرکار اور موثر زبان میں ظاہر ہو گئے ہیں کہ ہر جنبش کی تاثیر جادو بن کر جاگ اٹھتی ہے - ہندی الفاظ کے برتنے کا انھیں خاص سلیقہ حاصل ہے - اصلاحِ زبان کے سلسلہ میں آرزو کی خاص اردو کا تذکرہ خاصی اہمیت رکھتا ہے - ان کی مشہور شعری تصنیف "سریلی بانسری" خالص اردو میں ہے اس میں یہ اہتمام ہے کہ عربی و فارسی، الفاظ و تراکیب کو خارج کر کے ٹھیٹ اردو زبان میں دل کی بات دلنشیں اور تاثیرانہ انداز میں کہی گئی ہے - کہ زبان پر آرزو کے حاکمانہ تصرف کے ساتھ ساتھ ان کی قوتِ شعر گوئی کا بڑا شاندار ثبوت ملتا ہے

اردو قواعد کے متعلق ان کی تصنیف "نظام اردو" اپنے موضوع کی بہت اہم اور مستند کتاب ہے۔

سال پیدائش ۱۸۸۵ء

# اثر لکھنوی

نواب مرزا جعفر علی خاں اثر کی زندگی طویل شعری وادبی خدمت کا ایک روشن باب نگاہوں کے سامنے کھول دیتی ہے۔ اثر لکھنوی کے ایک معزز خاندان کے فرد ہیں ذہانت سلیقہ مندی اور فکر کی جودت وشعری نے انھیں اعلیٰ پایہ کی دینوی اور علمی وجاہتوں سے سرفراز کیا۔ اثر مشرقی شعر کا بہت ستھرا رچا ہوا مذاق رکھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی علوم اور رموز شعر وسخن پر بہت اچھی نظر رکھتے ہیں۔ انکی حوصلہ مند قوتِ فکر نے ماضی کے روشن نقوش کو حال کی ضوفشانیوں میں سمو لینے کی بڑی کامیاب کوشش کی۔ وہ غالب اور میر سے متاثر ہیں اور ان شعراء کے عمیق مطالعہ حسن خیال اور ابتہاو فکر کا ایک بہت واضح اور شائستہ تصور ان کے یہاں نمایاں کر دیا ہے جو لکھنؤ کے ادبی کلچر کی نفاستوں میں ڈوب کر ایک خاصہ کی چیز بن گیا ہے۔ میرؔ کی تقلید میں انہوں نے زبان کی صفائی۔ اسلوب کی پرکاری اور جذبہ کی بشریت پر خاص توجہ صرف کی ہے اور اپنی شعری انفرادیت کے جوہر کو علوئے تخیل اور پاکیزگی زبان وبیان کے حسین قالب میں ڈھال دیا ہے اثر کی قوتِ شعر گوئی کا ایک ممتاز کمال ان کی نظموں کے مجموعہ رنگ بست میں ظاہر ہوتا ہے انہوں نے اس مجموعہ میں عیز زبانوں کے چند شعری شاہکاروں کو لطیف ادبی بلاغت کے ساتھ اردو کا جامہ پہنایا ہے کشمیر کے مناظر رنگین پر ان کے شعری نغمے فکر وبیان کی لطافتوں میں ڈوبے ہوئے ہیں وہ ایک شائستہ مذاق ادبی نامدار مجھے گئے ہیں۔

اور انھوں نے اردو ادب کے رمز جمال کو بڑے نکھرے انداز میں نمایاں کیا ہے۔ انکی گرانمایہ شاعرانہ حیثیت اور ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومتِ ہند نے انھیں پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا ہے۔

# یگانہ چنگیزی

دور جدید کی شاعری میں یگانہ چنگیزی کا فن بڑے دلچسپ مطالعے کی چیز ہے وہ اس دور کے حوصلہ مند ارباب فن میں بلند انفرادی امتیاز کے مالک ہیں انہوں نے شعوری طور پر اپنی انفرادیت کے خدوخال کو شاعری میں نمایاں کرنے کی بہت دلیرانہ کوشش کی اور اپنے اسلوب فکر کو جدید اردو غزل گوئی کے عام رجحان سے واضح طور پر ممتاز کر لیا۔ یگانہ آرٹ کے بعض عناصر ادبی حیثیت سے گہری توجہ کے مستحق ہیں۔ انھیں فن پر حاکمانہ عبور حاصل تھا۔ وہ خیال کو بڑی صداقت اور بیباکی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے یہاں خودداری کا بہت واضح اور فکر میں گرمی اور توانائی پیدا کرنے والا تصور ملتا ہے۔ یگانہ آلام حیات سے منہ موڑنا نہیں جانتے وہ شان مردانگی کے ساتھ مخالفت زمانہ سے نبرد آزما نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو انفعالیت اور جذبات کی پژمردگی کے عناصر سے پاک کرنے میں مسلسل کوشش کی یگانہ نے بڑی مشاقی کے ساتھ غزل کو توانا اور جاندار خیالات و جذبات اظہار کا وسیلہ بنایا یگانہ کی طبیعت میں بلا کی انانیت تھی۔ ان کی خودی بڑی آسانی سے خود پرستی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یہی ان کے فکر وفن کی کمزوری ہے۔

# فراق گورکھپوری

ولادت ۱۸۹۶ء

نئے دور کے اردو شاعروں میں فراق گورکھپوری کا فن کئی حیثیتوں سے خاص مطالعہ

کی چیز ہے۔ انہوں نے اپنے شاعرانہ ذہن کی تعمیر میں مغربی فن و ادب کے اثرات اور ہندی کلچر کے رمز و روح کو بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اور بڑے فکر انگیز انداز میں سمو دیا ہے۔ ان کے یہاں ایک اعلیٰ معیار کے فن کاری کی بھرپور انفرادیت ملتی ہے۔ فراق کے تصور کی دنیا میں حسن کے اثرات اور زندگی کے مسائل لطیف ندرتوں اور جذبے کو جگانے والی شان کے ساتھ ابھرتے ہیں ان کا ذہن حسین مینا کاری کے ساتھ جذبوں شعر کے قالب میں منتقل کرتا ہے۔ انسان کی عظمت اور کمال کو انہوں نے بڑے دلکش پیرایوں میں ظاہر کیا ہے ان کے کلام میں گہرائی رس اور ترنم کی لطیف جھنکار ہے، معنی وہ اجزا نمایاں شان کے ساتھ موجود ہیں۔ جو شاعری میں دلنواز کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ انہوں نے غزل، نظم، رباعی، مختلف اصناف شعر میں قوتِ شعر گوئی کے جوہر کو نمایاں کیا ہے۔ انکا حقیقی شاعرانہ کمال غزل کے میدان میں ظاہر ہوتا ہے اس لئے کہ بھرپور انتہائی طور پر لطیف اور جذبہ انگیز بات کے لئے غزل ہی موزوں ٹھہرتی ہے اور فراق کو وجدانی طور پر ایسے ہی سخن سے ذوق شوق ہے۔ ہندی ادب تہذیب کے مزاج و روح میں فراق کو گہری بصیرت حاصل ہے اور انہوں نے اردو زبان ادب کو اچھی بصیرت سے بڑا فائدہ پہنچایا ہے فراق کی تنقید نگاری میں بھی انفرادیت کی ایک آن ہے جو علمی وزن و وقار کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ یگانہ کی طرح فراق کی خودداری بھی بہت آسانی سے خود پرستی بن جاتی ہے۔ فراق کے کلام کے یہ مقامات زیادہ خوشگوار نہیں معلوم ہوتے۔

# تحقیق و تنقید (وحید الدین سلیم)

زبان کی اصلاح و ترقی کے لئے ٹھوس تعمیری کام کرنے والوں میں پروفیسر وحید الدین سلیم

بہت ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ سو وہ پانی پت کے ایک مشہور خاندان سادات کے فرد تھے۔ عربی فارسی کی تکمیل کے ساتھ انہوں نے انگریزی میں بھی خاصا درک حاصل کیا تھا۔ مولانا حالی کی ان پر خاص نگاہ کرم تھی۔ ہندوستان کے بعض مشہور اخبارات کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں انہوں نے خاص امتیاز و کمال کے ساتھ نام پیدا کیا، آخری عمر انہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر، اردو گزاردی۔

سلیم اردو زبان کے مزاج اور ساخت کا بہت واضح شعور رکھتے تھے انہوں نے اپنی تحریروں کو عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ سے بوجھل نہیں ہونے دیا وہ ہندی کے میٹھے اور سریلے الفاظ نہایت بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے سادہ طرز نگارش کو رواج دینے میں بڑی قابل قدر کوشش کی سلیم بہت وسیع نگاہ اور بہت ٹھوس علم رکھتے تھے "ملٹی دایئس کی شاعری" اور عربوں کی شاعری" کے عنوان سے جو مضامین انہوں نے لکھے ہیں وہ مستقل تصنیف کی شان رکھتے ہیں۔ ان کی مشہور کتاب "وضع اصطلاحات" ان کے اعلیٰ تحقیقی مرتبے اور علمی شان و کمال کا کھلا ہوا ثبوت پیش کرتی ہے۔ سلیم اچھے پایہ کے شاعر بھی تھے اور انہوں نے اپنے کلام میں صداقت جذبہ اور حسن بیان دونوں کا نہایت لطیف امتزاج پیدا کیا ہے۔

## مولوی عبدالحق

ولادت ۱۸۶۹ء — وفات ۱۹۶۱ء

ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی زندگی خدمت زبان و ادب کا ایک شاندار مرقع نگاہوں کے سامنے آتی ہے، ان کی ساری زندگی محنت و جانفشانی اور من کی لگن کے ساتھ اردو کی لگن کے ساتھ اردو کی خدمت میں گذاری، انکی کوششوں نے انجمن ترقی اردو کو ایک زبردست علمی و ادبی ادارہ بنا دیا

4) تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان چلے گئے تادم آخر وہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے قائد و روح رواں رہے۔

اردو پر ڈاکٹر عبدالحق کے احسانات انمٹ ہیں۔ ان کی کوششوں سے قدیم اردو ادب کی بہت سی نایاب کتابیں منظر عام پر آگئیں ان کتابوں کی اشاعت سے نہ صرف اردو کے ادبی ذخیرہ میں قیمتی اضافہ ہوا بلکہ اس کے ساتھ زبان و ادب کے ارتقائی رفتار رلے پر بہا معلومات فراہم ہوگئیں۔ مولوی صاحب نے کسی موضوع پر کوئی مستقل اور سیر حاصل تصنیف نہیں پیش کی لیکن ان کے مقدمے، خطبے اور ادبی و تنقیدی مضامین اونچے معیار کی تصنیفی شان رکھتے ہیں۔ اردو زبان کے مزاج و ساخت پر مولوی صاحب کی نگاہ بہت گہری تھی۔ درادب کے وسیع مطالعہ نے انھیں مسائل شعر و ادب میں ایک اچھی بصیرت عطا کردی تھی۔ ان کا تحقیقی مذاق بہت منجھا ہوا تھا۔ انہوں نے بڑی مشاقی ہمہ گیر انداز میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور ماہرانہ سلیقہ مندی کے ساتھ زبان و ادب کے مسائل پر بیش قیمت معلومات پیش کی ہیں۔ مولوی صاحب بہت بے لاگ انداز میں تنقید کرتے ہیں انہوں نے حالی کی سادہ نگاری کو بلند فطری شان کے ساتھ اپنا لیا ہے۔ وہ بہت سادہ اور بے تکلف زبان میں اظہار خیال کرتے ہیں۔ گرے پڑے الفاظ کو اٹھا کر ادبی سطح پر پہنچا دینے کا انھیں خاص سلیقہ ہے، عربی و فارسی الفاظ کے بکثرت استعمال اور غریب و نامانوس تراکیب و طرز انشاء بنے اردو زبان کو محفوظ رکھنے میں مولوی عبدالحق کی خدمت بہت ممتاز ہے۔

مسعود حسن رضوی

سال پیدائش ۱۸۹۲ء

پروفیسر مسعود حسن رضوی کی ساری عمر مشرقی شعر و ادب کے بہت سنجیدہ مطالعہ میں گذری

ہے انہوں نے بڑے ریاض و محبت سے اردو شاعری کے حسن باطن تک رسائی حاصل کی ہے اور گہری ہمدردی کے جوش میں ڈوب کر اسے بے نقاب کیا ہے انکی مشہور کتاب "ہماری شاعری" انکی اعلیٰ الشعر فہمی، نکتہ آفرین ذہن اور گہرے ادبی اندازِ فکر پر پوری طرح دلالت کرتی ہے۔ مسعودی صاحب تحقیق کا بہت شائستہ اور اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں۔ ان کے ذاتی کتب خانہ میں بڑے گرانقدر ادبی نوادر موجود ہیں۔ فائز دہلوی کے دیوان کو مرتب کر کے انہوں نے شمالی ہند میں ادب کے آغاز پر ایک نئی روشنی ڈالی ہے "آب حیات" کا تنقیدی مطالعہ گو ایک مختصر کتاب ہے لیکن تحقیق کی بھی شان سے بہرہ ور ہے۔ مسعودی صاحب شائستگی سنجیدگی لطافت اور حسن خیال کو اسلوب نگارش کے بڑے حسین پیکر میں سمو کر پیش کرتے ہیں ان کی طرز تحریر میں ان کی طبیعت کی پوری نفاست جھلکتی ہے۔

## کلیم الدین احمد

"اردو شاعری پر ایک نظر" "اردو تنقید پر ایک نظر" کے مصنف پروفیسر کلیم الدین احمد جدید دور کے تنقید نگاروں کی صف میں ایک بالکل علیحدہ مسلک رکھتے ہیں۔ اور بعض حیثیتوں سے بالکل علیحدہ مقام بھی انہوں نے ایک چونکا دینے والے انداز میں اردو شعر و ادب پر اظہار خیال کیا ہے۔ کلیم الدین کو انگریزی ادب کے رموز جمال اور روح بلاغت میں بہت گہری بصیرت حاصل ہے۔

کلیم الدین کا ذہن انگریزی اثرات میں گہرے طور پر چھا لیا ہے اپنے خاص نقطۂ نظر سے انہوں نے اردو شاعری کا جائزہ لیا تو انھیں بہت مایوسی ہوئی یہی حال ان کے نزدیک اردو کے تنقیدی سرمایہ کا بھی ہے ایک خاص حیثیت سے کلیم الدین صاحب کی یہ خدمت قابل لحاظ ہے کہ انہوں نے ہمارے ذخیرۂ شعر و ادب کے نقائص اور خامیوں کو بہت اہمیت

اور امتیاز کے ساتھ اجاگر کیا ہے اور اس طرح اصلاح و ترقی کی راہ اختیار کرنے والوں کی مدد کی ہے لیکن بنیادی طور پر پروفیسر کلیم الدین کا نقطۂ نظر اردو ادب کے مزاج و طبیعت سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں اس ہمدردی کی نمایاں کمی ہے جو ایک مصنف مزاج ناقد میں ہونا چاہیئے۔ ادب ایک خاص مزاج ایک خاص افتاد اور ایک خاص پیرایۂ ظہور رکھتا ہے جب تک ان سب تک گہری نظر حاصل نہ ہو جائے ادب کے رمز جمال اور حسن باطن تک رسائی ممکن نہیں ہو سکتی پروفیسر کلیم الدین اپنے زبردست علمی تجربے اعلیٰ معیار کی تنقیدی صلاحیت اور دلیرانہ صاف گوئی کے باوصف اردو ادب کے مغز اور روح سے پورے طور پر آشنا نہیں معلوم ہوتے اردو تنقید کے متعلق جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ بہت حد تک صحیح ہوتے ہوئے بھی منزل کی صحیح رہبری نہیں کرتا وقت کے ساتھ ساتھ اردو میں فکر و نظر کی نئی راہیں کھل رہی ہیں۔ اور جائزۂ شعر و ادب کے نئے نئے اور روشن امکانات پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے ادب نے آزاد، حالی اور شبلی کے بعد نئی راہوں میں نئے انداز سے کار تنقید انجام دیا ہے۔ اور ہمیں اس بارے میں کسی خاص لگاؤ ندامت کی ضرورت نہیں۔

پروفیسر کلیم الدین کی کتابوں میں دلیرانہ اظہار کا ایک خاص جوہر ملتا ہے۔ یہ بجائے خود ایک بہت اچھا وصف ہے۔ اور کلیم الدین اسکے لئے ہر انداز قابل ستائش ہیں۔

# آل احمد سرور

دور جدید میں آل احمد سرور نے دلکش ادبی وقار کے ساتھ اردو کے تنقیدی ذخیرے میں نمایاں اضافہ کیا ہے سرور شعر و ادب کا بہت نکھرا اور رچا ہوا مذاق رکھتے ہیں۔ انہوں نے جدید علوم و فنون کی بصیرت کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے ادبی مطالعہ میں سمو دیا ہے

ان کے یہاں حسن اعتدال کی ایک روشنی ہے۔ جو بہت دلکش اور جاذب توجہ ہے۔ وہ لطیف جنبش قلم کے ساتھ زیر بحث مسئلے سے حجابات اٹھاتے ہیں اور سرورِ طبیعت کے عالم میں سخن دلکش پیرایہ میں کہہ جاتے ہیں۔ سرور شعر و ادب کے نفسیاتی تجزیہ میں بھی فکر و بیان کی لطافت بڑے اہتمام سے قائم رکھتے ہیں۔ وہ ادبی نکات کو فنی چابکدستی سے ابھارتے چلے جاتے ہیں۔ اور لطیف انداز میں اپنا مطمح نظر واضح کر دیتے ہیں۔ ترقی پسندی کے اصول و روایات کو انہوں نے طبیعت کے گہرے رچاؤ کے ساتھ قبول کیا ہے۔

انھوں نے ہمارے شعر و ادب کے بعض چوٹی کے ارباب فن کے شخصیت ذہن اور ادبی اقتدار کا بہت دلآویز نفسیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کی تنقید میں ادبی چاشنی بڑے نکھرے ہوئے انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ بات کو بڑے رچاؤ، آرائش اور نکھرے ہوئے انداز میں کہنے کے عادی ہیں "تنقید کیا ہے" "نئے اور پرانے چراغ" "تنقیدی اشارے" ان کے تنقیدی مضامین کے مشہور مجموعے ہیں۔

سرور اچھے نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کا بہت لطیف مذاق رکھتے ہیں۔ انکی نظموں اور غزلوں میں فکر سنجیدگی ہلکی آنچ میں پلے ہوئے تصورات دلکش پیرایہ بیان میں ظاہر ہوتے ہیں انہوں نے اپنی گرمیٔ فکر سے شاعرانہ رعنائی بیان کو ایک نیا نکھار بخشا ہے۔

# سید احتشام حسین رضوی

سید احتشام حسین رضوی دور جدید کے ادبی نقادوں میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں۔ انہوں نے علمی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ بہت سلجھے ہوئے انداز میں ترقی پسند نقطہ نظر کو ادبی تنقید میں سمویا ہے۔ احتشام حسین صاحب کی تجزیاتی صلاحیت بہت توانا

اور بڑے معیار رکھا ہے وہ اپنے خاص نقطۂ نظر سے زیرِ بحث موضوع کا بہت بے لاگ جائزہ لیتے ہیں اور دلنشیں انداز میں استدلال کی واضح منطقی ترتیب کے ساتھ اپنے مطالعہ و فکر کو پیش کرتے ہیں۔ احتشام صاحب نے تنقید کی اس روایت کو بڑی تقویت پہنچائی ہے جو رنگ دلی سے بے نیاز ہو کر مسئلے کو اس کے صحیح خد و خال میں دیکھتی ہے اور تاثر کی رنگینیوں میں ڈوبے بغیر خالص علمی و تنقیدی انداز میں اخذ نتائج کر لیتی ہے ادب اور تنقید کا ترقی پسند نقطۂ نظر اپنی مقبولیت کے باوجود اردو میں ابھی ایک نئی چیز ہے۔ اس کی صحیح تشریح و تعبیر اور خاطر خواہ وضاحت اصولوں کے بیان کرنے سے زیادہ مہارت فن کے ساتھ علمی تنقید میں ان اصولوں کے برتنے سے ہو گئی۔ "تنقیدی جائزے" "روایت و بغاوت" "ادب اور سماج" اور "تنقید و عملی تنقید" احتشام حسین کی مشہور کتابیں ہیں۔ ان کتابوں میں ان کے تنقیدی تصورات بھی پورے وضاحت کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور اس امر کا بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اپنے تصورات کی روشنی میں بڑی مشاقی دیدہ وری اور چابکدستی کے ساتھ کار تنقید انجام دے سکتے ہیں۔ احتشام صاحب کی تنقید نے ہمارے ادب کے بعض گوشوں کو فکر و معنی کے نئے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔

# انشائیہ ، مقالات ، صحافت

## سید علی بلگرامی

پیدائش ۱۸۵۱ء — وفات ۱۹۱۱ء

سید علی بلگرامی کے علمی کمالات پورے طور پر تصنیف و تالیف کے سانچے میں ظاہر نہیں ہونے پائے وہ اس پائے کے عالم تھے۔ کہ ان کے ٹکر کے لوگ ذرا مشکل سے پیدا ہوتے

ہیں۔ الغرض مشرق و مغرب کی بہت سی زبانوں میں عالمانہ بصیرت حاصل تھی۔ ان کا ذہن اعلیٰ درجہ کے اختراعی ملکہ سے بہرہ ور تھا۔ انہوں نے کوئی طبع زاد تصنیف نہیں چھوڑی لیکن ان کے ترجمے ادبی دنیا میں ان کی لازوال علمی شہرت کی ضمانت بن گئے ہیں۔ سید علی بلگرامی نے فرانسیسی مورخ ڈاکٹر موسیو لیبان کی عربی اور ہندی تہذیب پر مشہور عالم تاریخی تصانیف کا ترجمہ "تمدن عرب" اور تمدن ہند" کے نام سے ایسی مشاقی فن اور زبان و بیان پر اس قدر حاکمانہ تصرف کے ساتھ کیا ہے۔ کہ ترجموں میں مستقل تصنیف کی شان پیدا ہو گئی ہے۔ وہ ضخیم علمی کتابوں کا ترجمہ اس انداز سے کیا کہ ایک جملے میں بھی ترجمہ پن نہ آنے پائے۔ اور عبارت کی روانی، زبان کی دلکشی اور اسلوب نگارش کا علمی وقار از اول تا آخر یکساں ہمواری کے ساتھ برقرار رہا ہے۔ ادبی حیثیت سے ایک عظیم کارنامہ ہے۔ تمدن عرب اور تمدن ہند کی بدولت سید علی بلگرامی کا نام اردو ادب کی تاریخ میں امر ہو گیا ہے۔

## مہدی افادی

وفات
سنہ ۱۹۲۱ء

مہدی افادی کی شخصیت ایسی ادبی جدت طرازی اور کمال آفرینی کا ایک نہایت ستھرا اور لطیف نمونہ ملتا ہے۔ مہدی نے چند مضامین لکھ کے ادبی دنیا میں نہ مٹنے والا نام پیدا کر لیا ہے مہدی ادب کا بہت رچا ہوا اور شگفتہ مذاق رکھتے تھے ان کے ذہن میں اعلیٰ درجہ کا اختراعی ملکہ تھا۔ وہ نئی ترکیبیں بھرپور انداز میں ڈھال لیتے ہیں۔ مہدی انشا کی لطافت پر خاص نگاہ رکھتے ہیں۔ اور حسن آفرین روانی قلم کے ساتھ اپنے خیالات ایسے دلکش اور تراشے ہوئے پیرایہ میں بیان کر سکتے ہیں کہ ادبیت موج نسیم کی طرح رقصاں ہو جاتی ہے یورپ کی رومانوی تحریک کا مہدی کے ادب پر بہت گہرا اثر تھا۔ اور یہ اثر انکے رنگ انشاء

بھی بڑے سجل روپ میں جھلک پڑا ہے۔ جدید اردو ادب کے بانیوں کے متعلق مہدی نے جو مضامین لکھے ہیں وہ گہرے مطالعہ اور سنجیدہ فکر کا نچوڑ ہیں۔ انکی رائے بہت محکم اور بہت تلی ہوئی ہے۔ "افاداتِ مہدی" ان کے مضامین کا مجموعہ ہے اس میں چند پارہ ہائے ادبِ لطیف اور چند ادبی اور تنقیدی جائزے ہیں۔ لطافتِ فکر و انشا کی بدولت افاداتِ مہدی کا شمار اردو نثر کے منتخب شہ پاروں میں ہوتا ہے مہدی کے خطوط بھی ادبی حاصلہ کی چیز ہیں۔

ولادت ۱۸۷۳ء

# ظفر علی خاں

وفات ۱۹۵۶ء

صحافت کی راہ سے ادب کی یادگار خدمات کرنیوالوں میں مولانا ظفر علی خاں کا نام بہت ممتاز ہے۔ موجودہ صدی میں سیاسی بیداری اور انقلابی جدوجہد کی جو لہر اٹھی تھی اس میں مولانا ابو الکلام کے "الہلال" محمد علی مرحوم کے "کامریڈ" اور "ہمدرد" کی طرح مولانا ظفر علی خاں کے مشہور عالم روزنامہ "زمیندار" کی حیثیت بہت نمایاں اور ممتاز ہے نثر اور نظم دونوں ان کی جولانیٔ قلم سے یکساں سیراب ہوئے۔ وہ اعلیٰ ذہن اور اعلیٰ درجہ کی اختراع قوت کے مالک تھے۔ ان کو مشاقیٔ قلم کا وہ جوہر حاصل ہے جو معمولی سی بات کو باوقار اور پرتاثیر انشا کے پیکر میں پیش کر سکتا ہے۔ سیاسیات ملکی زندگی کے مختلف الوضع مسائل علمی و فلسفیانہ مباحث اور افسانے ظفر علی خاں نے موضوعات پر یکساں مہارتِ فن کے ساتھ قلم اٹھایا۔ انھیں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب کے برتنے میں خاص قدرت حاصل ہے۔ وہ جولانیٔ فکر کو کیف حسن کاری کے ساتھ قلم کی روانی میں منتقل کرتے ہیں ظفر علی خاں نے انگریزی سے جو ترجمے کئے ہیں وہ ان کی قابلیت اور قدرتِ زبان و بیان کا حیرت انگیز نمونہ ہیں۔ ڈریپر کی معرکۃ الآرا تصنیف کا ترجمہ ظفر علی خاں نے "معرکۂ مذہب

رسائنیں" کے نام سے اس درجہ قدرتِ فن کے ساتھ کیا ہے۔ کہ کتاب بالکل انکے ذہن کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ سیاسی مسائل پر ظفر علی خاں کے قلم کی آتش بازیاں شعلۂ جوالا کا منظر نگاہ کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ وہ بہت جذباتی قسم کے آدمی تھے اور جذبات کی شدتیں ان کے نوکِ قلم پر رواں رہتی تھیں ظفر علی خاں ایک مشاقِ فن شاعر بھی تھے۔ زود گوئی ان کی طبیعت کا خاص وصف تھی۔ وہ شعر اس قدر تیز اور روانی سے کہتے تھے۔ جیسے آمد سخن میں آدمی بات میں بات نکالتا جاتا ہے۔ ظفر علی خاں کو الفاظ، محاورات اور تراکیب کے بہت وسیع ذخیرے پر حاکمانہ تصرف حاصل تھا۔ ایسے ایسے ثقیل غریب اور نامانوس قافیے جن کا اشعار میں نظم کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ظفر علی خاں نہایت بے تکلفی اور روانی کے ساتھ نظم کر جاتے ہیں۔ عالم اسلامی ہندوستان کے مسائل آزادی، تمدنی سوالات، برطانوی سامراج۔ کانگریس اور مسلم لیگ ظفر علی خاں کے خاص موضوعات فکر رہے ہیں۔ ان کا نعتیہ کلام جوشِ طبیعت اور لطافتِ فکر کا آئینہ دار ہے۔

ظفر علی خاں کا بیشتر کلام وقتی مسائل سے متعلق ہے اور اسی لئے اس میں ابدیت کی کوئی شان نہیں ہے۔ کاش ظفر علی خاں دلجمعی اور سکون طبیعت کے ساتھ شعر و ادب کی طرف اپنی توجہ کرتے تو اردو ادب کا خزانہ کہیں زیادہ آبدار موتیوں سے مالا مال ہوتا۔

# سید سلیمان ندوی

وفات ۱۹۵۳ء

علامہ شبلی کے فیض تربیت سے نمود و کمال کرنے والوں میں سید سلیمان ندوی کا نام سرفہرست آتا ہے۔ وہ اس دور کے بہت بڑے محقق گراں پایہ ادیب صاحب طرز انشاپرداز اور امور دینیات کے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی بلند علمی وقار و متانت کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ ان کا لازوال ادبی کارنامہ سیرت النبیؐ ہے جس کی شبلی نے ابتداء کی تھی۔ سید سلیمان نے بے انتہا محنت اور جانفشانی سے اس تصنیف کو اس انداز میں مکمل کیا کہ وہ اس موضوع پر دنیا کے ادب میں صف اول کی کتاب ہوگئی ہے سیرت عائشہ انکی ایک اعلیٰ معیار کی سوانحی تصنیف ہے عرب و ہند کے تعلقات عربوں کی جہاز رانی اور خیام وہ کتابیں ہیں جن میں وافر مطالعہ اعلیٰ تحقیق اور زور قلم کا ایسا نمونہ ملتا ہے جسکی مثالیں اردو میں شاذ و نادر ہی مل سکتی ہیں۔ حیات شبلی کے نام سے انہوں نے اپنے استاد علامہ شبلی کی ضخیم سوانح عمری بڑی محنت اور مہارت فن کے ساتھ لکھی اردو زبان و ادب پر ان کے مقالات اور خطبے تحقیقی بصیرت کے قیمتی موتی لگا ہوں کے سامنے لے آتے ہیں۔ سید سلیمان کی انشاء میں ایک بیدار فکر محتاط عالمانہ ذہن اور نہایت ستھری اور لطیف طبیعت کا جوہر بکھرا ہوا ملتا ہے۔ وہ بہت متانت اور سنجیدگی سے قلم اٹھاتے ہیں۔ اور از اول تا آخر ادبی بلاغت کا معیار قائم رکھتے ہیں۔

سید سلیمان کی ادارت میں اردو کے مشہور ادبی و مذہبی ماہنامہ معارف کو زبردست عروج و فروغ حاصل ہوا۔ انکی قیادت اور ان تھک کوششوں نے دار المصنفین کو شبلی کے خواب کی حسین و جمیل تعبیر بنا دیا۔

ولادت ۱۸۷۸ء

# خواجہ حسن نظامی

وفات ۱۹۵۵ء

دورِ جدید کے انشاء پردازوں میں خواجہ حسن نظامی کو ایک ممتاز مرتبہ حاصل ہے خواجہ صاحب کی طبیعت میں ایک دلنواز انوکھا پن ہے۔ وہ بڑی بے تکلفی سے اور بڑے مزے سے چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے کارآمد نتیجے نکال لیتے ہیں۔ اور انتہائی انوکھے اور نرالے انداز میں قلم کی ہلکی ہلکی جنبشوں سے کر دیتے ہیں۔ غدر میں دہلی کی تباہی کی داستان خواجہ صاحب کے قلم کا ایک یادگار کارنامہ ہو گیا ہے۔ خواجہ صاف ستھری مورچ لطافت میں ڈوبی ہوئی دہلی کی ٹکسالی زبان لکھنے پر بدرجہ اعجاز قدرت رکھتے ہیں۔ ان کا یہ وصف اس قدر ممتاز ہے کہ کوئی دوسرا ادیب سادہ نگاری میں ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ بظاہر غیر اہم عنوانات پر ان کی لطیف خیال آرائی تخیل کا کرشمہ معلوم ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب کے چھوٹے چھوٹے بلیغ اور معنی خیز فقرے نشتر بن کر دل میں اتر جاتے ہیں۔ اور ان کا اثر بھرپور رہتا ہے۔ خواجہ صاحب بہت زود نویس تھے۔ انہوں نے تصنیف کا انبار لگا دیا ہے۔ خواجہ صاحب کے اخبارات ورسائل نے اردو زبان کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔

وفات ۱۹۵۹ء

# ابوالکلام آزاد

مولانا ابوالکلام آزاد دورِ جدید کے مثالی ذہنوں میں ایک ممتاز مرتبہ رکھتے ہیں۔ انکے علم کی وسعت اور فکر کی گہرائی اس درجہ کی ہیں کہ ان کے مخصوص میدانوں میں مولانا نے نمایاں امتیاز و وقار کے ساتھ حصہ لیا اور اکثر نازک مرحلوں پر ان کے ناخن تدبر کا اعجاز ظاہر ہوا۔ علامہ شبلی نے اسلامی علوم کو از سرِ نو زندہ کرنے اور مسلمانوں

میں دینی و قومی خودداری اور عظمت ماضی کے احساس کو شانِ نمود کے ساتھ ابھارنے کا جو تاریخ آفرین کام شروع کیا تھا۔ اسے مولانا ابوالکلام آزاد نے بے مثال خطیبانہ بلند آہنگی اور حیرت انگیز علمی "تجربے کے ساتھ آگے بڑھایا (ان کا مشہور رسالہ "الہلال" ملت اسلامی اور مشرق کے لئے نئی زندگی کا خوش آئند پیام بن کر ظاہر ہوا۔ الہلال کے صفحات پر خطیبانہ انشا پردازی کے وہ بلیغ کمالات نمایاں ہوئے کہ سارا "ملک الہلال" کے غلغلوں سے گونج اٹھا۔ ابوالکلام کو قرآنی علوم اور عربی ادب میں زبردست بصیرت حاصل ہے۔ فارسی کے مغز و روح انکی طبیعت میں رچی ہوئی ہے۔ عربی اور فارسی کے منتخب لوازم آرائش سے مرصع کر کے انھوں نے اپنی انشاء کو بھرپور معنویت، ادبی وزن و وقار اور بلند فکر کا وہ آہنگ عطا کیا جو اپنی نظیر آپ ہو کر رہ گیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ مولانا کی تحریروں میں شگفتہ روانی اور پر تاثیر سادگی کا جوہر بڑے امتیاز کے ساتھ نمایاں ہو گیا ہے۔ ان کی تفسیر قرآن نہ صرف اپنے زبردست علمی اجتہاد و نکتہ آفرینی بلکہ بلیغ و پر تاثیر سادہ نگاری کے اعتبار سے جدید اردو ادب میں ایک شاندار اضافہ ہے۔ ابتدائی دور میں انکی ایک خود نوشت سوانح عمری "تذکرہ" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ "الہلال" میں علمی سیاسی اور مذہبی موضوعات پر انکے جو مضامین نکلے وہ مختلف مجموعوں کی صورت میں شائع ہو چکے ہیں (مولانا کے کارناموں میں "غبار خاطر" کو ایک اہم امتیاز حاصل ہے۔ غبار خاطر مولانا کے ان خطوط کا مجموعہ ہے۔ جو انھوں نے دوسری جنگ عظیم کی نظربندی کے دوران میں مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کو لکھے۔ غبار خاطر لطافت انشا اور بلیغ خیال آرائی کے اعتبار سے اردو ادب میں اپنے طرز کی بہت بلند پایہ چیز ہے (

پیدائش ۱۸۹۳ء

# عبدالماجد دریابادی

دورِ جدید کے انشاء پردازوں میں مولانا عبدالماجد دریابادی ایک خاص طرزِ انشاء کے مالک ہیں مشرقی اور مغربی علوم پر ان کی نگاہ بہت وسیع ہے۔ مولانا نے دبستان لکھنؤ کی ادبی لطافتوں کو بڑی بلند نظری اور نکھرے ہوئے علمی مذاق کے ساتھ اپنایا ہے۔ انہوں نے طبیعت کے بڑے ریاض اور چاؤ کے ساتھ اپنے طرزِ انشا کی تعمیر کی ہے۔ وہ لطیف طبیعت کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں۔ اور فکر و بیان کے لطیف تسلسل اور روانی کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ عبدالماجد کو فنِ ترجمہ پر بھی مالکانہ قدرت حاصل ہے۔ خشک فلسفیانہ موضوعات پر انہوں نے قلم کی اسی شگفتگی کے ساتھ لکھا ہے۔ کہ ایک ایک لفظ میں لطیف ادبیت کا نکھار پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا اپنی جولانیٔ ذہن سے مزاح شگفتہ خیال اور معنی خیز طنز کے نکتے بڑے مزے سے پیدا کر دیتے ہیں۔ اردو کے بعض نامور شاعروں اور ادیبوں پر جو مضامین انہوں نے لکھے ہیں۔ وہ دلچسپ نفسیاتی مطالعے اور گہری ادبی بصیرت سے معمور ہیں۔ "اردو کا واعظ شاعر" مرزا رسوا کے قصے کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے" "نیا آئینِ اکبری" "جھوٹ میں سچ" "اردو کا ایک بدنام شاعر" یہ اور دوسرے ادبی و تنقیدی مقالات مولانا کی سنجیدہ نکھری ہوئی ادبی فکر کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔ جہاں مولانا کا قلم جذبات کے رنگ میں ڈوب جاتا ہے۔ وہاں انشاء کے جوبن پر بہار آجاتی ہے۔ مولانا محمد علی کی جو لائف انھوں نے

لکھی ہے وہ تاثراتی سوانح نگاری کا ایک بہت عجیب و غریب مجموعہ ہے "پیچ محمدی" اور اب ""صدق جدید"" میں واقعات اور کوائف عالم پر مولانا کے جو مختصر تبصرے وہ بھرپور طنز اور جاندار نثریے کا عمدہ نمونہ ہوتے ہیں۔ "فلسفہ جذبات" "مکالمات برکلے" "فلسفہ اجتماع" "تاریخ اخلاق یورپ" "محمد علی حکیم الامت" "نقوش و تاثرات" مولانا کے تراجم و تصانیف میں خاص امتیاز و شہرت رکھتے ہیں۔ آپ کے علمی، ادبی اور فلسفیانہ مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ولادت ١٨٨٧ء

# نیاز فتح پوری

اردو کے مشہور و معروف علمی رسالے "نگار" کے ایڈیٹر مولانا نیاز فتح پوری جدید اردو ادب میں ایک باکمال انشاپرداز اور بلند نظر ناقد کی حیثیت سے بہت اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہیں۔ انہوں نے اپنے ادبی فن کو حسن کمال کے ساتھ زمانے کی بڑھتی ہوئی رو کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے اور مسلسل جنبش قلم سے اردو نثر میں علمیت تنقیدی حسن آفرینی اور خیال آرائی کے موتی بکھیر دیئے ہیں۔ نیاز کے ذہن میں طرح داری اور اعلیٰ پایہ کے ذوقِ اختراع کے ساتھ ایک بانکپن اور ایک ابھری ہوئی انفرادیت بھی ہے۔ انہوں نے حوصلہ مندی کے ساتھ ادب کی راہوں میں اپنے ذہن کے نقش قائم ہیں۔ نیاز کی تحریروں کا آغاز ادب لطیف اور افسانہ کی راہ سے ہوا۔ ابتدا ہی میں انہوں نے اعتبار ذوق کی بدولت اپنے اسلوب نگارش میں رنگینی بیان کی ایک خاص دلکش اور ترکیبوں کی نئی تراش خراش سے ایک خاص کیفیت پیدا کر لی ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب تحریر نکھرتا اور سنورتا گیا۔ نیاز نے مختلف حیثیتوں سے اردو ادب کی خدمت کی ہے دلچسپ، موضوعات پر

ان کی لطیف خیال آرائی گہری ادبی دلکشی سے بہرہ ور ہے "نگارستان" "جمالستان" ادب لطیف میں اپنے طرز کی بہت ممتاز کتابیں ہیں۔ قدرت نے ان کو اعلیٰ پایہ کے ملکہ شعر فہمی سے بہرہ ور کیا ہے۔ ان کی ادبی تنقیدیں شعر ادب کے رموز و جمال میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت پیدا کرتی ہیں۔ علمی۔ موضوعات پر نیاز کے خامہ فرسائی سنجیدہ نگارش کا ایک بلند معیار قائم کیا ہے۔

نگار کے خاص نمبر اردو کے تنقیدی و علمی ذخیرہ میں مستقل اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آج کل ان کی توجہ خصوصیت کے ساتھ تاریخ اسلام کے اہم علمی و سیاسی پہلوؤں کے اہم علمی سیاسی پہلوؤں پر صرف ہو رہی ہے۔ شاعر کا انجام، شہاب کی سرگزشت، جمالستان، نگارستان، جذبات بھاشا، ترغیبات جنسی، من و یزداں، اور مالہ، و ماعلیہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ ان کی دقیق ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا ہے۔

## قاضی عبدالغفار

وفات ۱۹۵۶ء

جدید اردو ادب میں قاضی عبدالغفار پائیدار امتیاز و شہرت کے مالک ہیں انھوں نے صحافت، ادب لطیف، علمی مقالہ نگاری غرض مختلف راہوں سے ادبی خدمات انجام دی ہیں۔ قاضی صاحب نے ہمارے موجودہ تہذیبی سماجی اور سیاسی مسائل کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور موثر حسن آفرینی کے ساتھ جذبہ اصلاحی کو انشاء کے پیکر میں پیش کر دیا ہے۔ ان کی مشہور کتاب "لیلیٰ کے خطوط" دور جدید کے سماج پر نہایت فکر انگیز اور بھرپور ادبی طنز ہے۔ قاضی صاحب قلم کی روانی میں بڑی بے ساختگی کے ساتھ، لطافت خیال

شگفتہ بیانی، اور بہر کار طنز کے موتی بکھیرتے جاتے ہیں۔ انہوں نے واضح بلند اخلاقی مقصد کے تحت قلم اٹھایا ہے اور حسین ادبی ضابطوں کے ساتھ اپنے مقصد کو پیش کیا ہے ادب لطیف کے لکھنے والوں میں قاضی صاحب کا مقام بہت بلند اور منفرد ہے قاضی صاحب کی زندگی کا بہت حصہ سیاسی جدوجہد میں گذرا اسی لئے ان کے یہاں فکر وطبیعت کی حوصلہ مندی ایک خاص شان امتیاز کے ساتھ نمایاں ہے۔ ان کی سوانحی کتابیں علمی تحقیق اور بلند نگاہی کا بہت روشن نمونہ ہیں۔ آثار جمال الدین اور آثار ابوالکلام آزاد ہمارے سوانحی ادب میں بیش قیمت اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد قاضی صاحب انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے اردو کی خدمت میں پیش پیش رہے تقسیم ہند کے ہنگاموں میں انجمن ترقی اردو (ہند) کا دفتر قریب قریب بالکل مٹ گیا اور انجمن کا کاروبار بالکل معطل ہو کر رہ گیا تھا۔ قاضی صاحب کی کوششوں سے انجمن ترقی اردو کو ہند میں نو جیون ملا۔

# ناول وافسانہ

## رتن ناتھ سرشار

اردو ادب کے زندۂ جاوید فن کاروں میں سرشار کا نام صفِ اوّل میں آتا ہے سرشار ۱۸۴۶ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابھی صرف چار برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا رواج عام کے مطابق بچپن میں سرشار نے عربی، فارسی پڑھی کیننگ کالج میں انگریزی کی کچھ تعلیم بھی حاصل کی۔ سب سے پہلے ضلع کھیری میں ٹیچر ہوئے انکے مضمون نگاری کا سلسلہ اس زمانے سے شروع ہو گیا تھا۔ اور وہ برابر کشمیری پنڈتوں کے ماہوار رسالہ "مراسلۂ کشمیری" اودھ پنچ "میں اپنے مضامین بھیجا کرتے تھے۔ ترجمہ کرنے کا انہوں نے ایک خاص سلیقہ حاصل کر لیا تھا۔ اور پھر رشتہ تعلیم کے رسالوں میں وہ علمی مضامین کے ترجمے برابر بھیجتے تھے۔ ۱۸۷۸ء میں انہوں نے علمی طبعی کتاب کا ایک ترجمہ "شمس الضحٰی" کے نام سے کیا۔ اسی سال وہ اودھ اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس اخبار کے کالموں میں اس معرکہ آزاد افسانہ کی بنیا دپڑی جو فسانہ آزاد کے نام سے مشہور ہے۔ سرشار کے دورادارت میں اودھ اخبار کو بہت ترقی ہوئی ان کے زور قلم اور بالخصوص افسانہ، آزاد کی دلکشی کا یہ عالم تھا کہ پورے ملک میں دھوم مچ گئی۔ فسانۂ آزاد کے ساتھ سرشار کی ناول نگاری کے طویل سلسلہ کا آغاز ہو گیا۔ لیکن ان کی دوسری تصنیف فسانۂ آزاد کے معیار کو نہ پہنچ سکی۔ ۱۸۹۵ء میں وہ حیدرآباد گئے جہاں ان کا خیر مقدم بڑی گرمجوشی کے ساتھ ہوا مہاراجہ کشن پرشاد نے اپنا کلام، اصلاح کے لئے سرشار کو دکھانا شروع کیا۔ اور اس کے عوض میں دوسو روپیہ وظیفہ مقرر کر دیا۔۔۔

حیدرآباد میں کچھ عرصہ تک انہوں نے اخبار "دبدبۂ آصفیہ" کی ادارت کی آخری عمر میں شغل مے نوشی بہت بڑھ گیا تھا آخر ۱۹۰۳ء میں جام موت بھی پی لیا۔

سرشار حقیقی معنی میں رند مشرب تھے بڑے آزاد منش اور تعصب اور مذہبی تنگ نظری سے بالکل پاک تھے۔ طبیعت میں ظرافت و شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری تھی بات کرنے کے لئے زبان کھولتے یا لکھنے کے لئے قلم اٹھاتے تو زندہ دلی قدم چومتی اور انبساط کی لہریں چھیڑ چھاڑ کرتی ہوئی نظر آتیں۔ سرشار بڑے ذہین تھے حافظہ قیامت کا پایا تھا طبیعت موج میں آجاتی تو مضامین دماغ سے ساون بھادوں کی گھٹا بن کر برس جاتے لکھنے پر بلا کی قدرت تھی ہمیشہ برجستہ و قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ سرشار نہایت خوش گو شاعر بھی تھے۔ امیر کے شاگرد تھے اور خوب کہتے تھے ان کی حقیقی حیثیت ایک افسانہ نگار کی ہے افسانۂ آزاد کے علاوہ "سیر کہسار" "جام سرشار" "کامنی" "خدائی فوجدار" اور "رنگے سیار" وغیرہ ان کے مشہور افسانے ہیں۔

ادب کی تاریخ میں انکی پائیدار عظمت کا انحصار "فسانۂ آزاد" پر ہے۔ فسانۂ آزاد چار ضخیم جلدوں پر پھیلی ہوئی ایک بہت طویل کہانی ہے جس میں نہ معلوم کتنی ضمنی کہانیاں شامل ہو گئی ہیں۔ فسانۂ آزاد کا تخیل سرشار کے ذہن میں مغربی ادب کے اثر سے پیدا ہوا۔ سرشار نے اس افسانے میں لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کی اتنی زندہ اور جاندار تصویر کھینچی ہے اور اس مصوری میں لطافت خیال زندہ دلی شگفتہ طبعی اور زور قلم کو اس خوبصورتی کے ساتھ سمویا ہے کہ یہ کتاب سوسائٹی کی مرقع کشی کا ایک حیرت انگیز نمونہ بن گئی ہے۔ فسانۂ آزاد کا ایک امتیازی وصف اس کی کردار نگاری ہے۔ سرشار کا مشاہدہ بہت وسیع تھا اور ان کا قلم اعلیٰ پایہ کی مشاقی اور چابک دستی سے بہرہ ور تھا۔ فسانۂ آزاد کا سب سے اہم کردار خواجہ بدیع الزماں "خوجی" ہے جو سرشار کے ذہن کی شاہکار تخلیق ہے۔ خوجی کی ذات میں لکھنؤ کا تمدن اور تہذیب کا ایک

پہلو تخیل کی بے مثل حسن کاری کے ساتھ صورت پذیر ہو گیا ہے۔ خوجی بہت دلچسپ کیرکٹر ہے۔ انکی لمبی چوڑی باتیں، بلند آہنگ دعوے، پہلوانوں کے انداز میں پینترے - بدلنا اور بات بات پر قرولی نکال لینے کی دھمکی، یہ اور اسی قبیل کے دوسرے اوصاف اسے بے انتہا دلعزیز بنا دیتے ہیں۔ سرشار کی ظرافت جو فسانہ آزاد کی ضخیم جلدوں پر چنبیلی کے پھولوں کی طرح بکھری ہوئی ہے، ذات میں اپنے نقطۂ کمال پر پہنچ جاتی ہے اردو افسانے کو خوجی دے کر سرشار نے ایک ایسا کردار دیدیا جسکا ہر تازہ مطالعہ ادبی بصیرت کیلئے باب کھولتا رہے گا۔ سرشار کی کمزوری یہ ہے کہ وہ سیل رواں کی طرح بہیں جاتے ہیں۔ انکی کہانی میں کوئی واضح اور منظم پلاٹ نہیں ملتا ترتیب اور تنظیم کیلئے جس توجہ اور استعدی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرشار کے پاس اس کے لئے وقت ہی نہیں تھا۔ فسانۂ آزاد صحیح معنی میں ناول نہیں ہے اس میں داستان کی شان زیادہ نمایاں ہے بیجا نہ ہو گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ کئی ناولوں کا مجموعہ ہے یہ سرشار کے فن کی کمزوری ہے لیکن اس سے قطع نظر فسانۂ آزاد میں زندگی کی جو مصوری ملتی ہے۔ وہ اردو کے بہت کم ناولوں کے حصہ میں آئی ہے۔

سرشار بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ انکی تحریر میں زندگی کا رقص والہانہ ملتا ہے وہ بہت مزے لے لے کر ہنستے قہقہے لگاتے۔ داستان طرب ستاں لئے چلے جاتے ہیں۔ انکی صحیح حیثیت ایک ادبی مصوری اور ایک کامیاب طنز نگار کی ہے کہیں کہیں انھوں نے ناصح بننے کی بھی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ منصب سرشار کو زیب نہیں دیتا۔ سرشار کے فن نے اردو افسانہ نگاری کو صحیح معیار سے بہت قریب کر دیا ہے۔ اور افسانے کی بہت سی راہیں کھول دیں۔

# عبد الحلیم شرر

ناول نگاری کے سلسلے میں سرشار کے بعد شرر کا نام آتا ہے۔ شرر سنہ ۱۸۶۰ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے کچھ دنوں گھر پر تعلیم پائی۔ سات آٹھ برس کا سن تھا کہ مٹیا برج کلکتہ میں انکے والد نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔ سلطان واجد علی شاہ کے ذوق ریاست اور نفاست پسندی نے مٹیا برج نے چھوٹے پیمانے پر لکھنؤ آباد کر دیا تھا علم و فن اور شعر و شاعری کی پہیلیوں سے فضا معمور تھی شرر نے یہیں ماہر فن اساتذہ سے عربی و فارسی اور مختلف علوم درسیہ حاصل کئے۔ انکی ذہنی طبیعت میں شہزادوں کی صحبت اور درباری ماحول کا بھی ہاتھ رہا۔ پندرہ برس کی عمر میں وہ اپنے نانا منشی قمر الدین کی جگہ ملازم دربار ہو گئے اس ملازمت سے مولانا کو بڑے ادبی فائدے حاصل ہوئے۔ انہیں خطوط کے اس ذخیرے کو دیکھنے کا موقعہ ملا جو سلطان واجد علی شاہ کے نام بیگمیں بھیجا کرتی تھیں۔ اور جو عاشقانہ عبارت آرائی اور حسن انشاء کا بہت حسین و جمیل نمونہ ہوتے تھے۔ شرر نے خود لکھا ہے "بہرحال میری انشاء پردازی کا پہلا نصاب یہی تو وہ نامے تھے جو ظاہری صورت اور باطنی رنگ عبارت دونوں حیثیتوں سے بہت ہی دلکش تھے" انیس برس کے سن میں وہ لکھنؤ آ گئے اور مولوی عبد الحی سے عربی کی کتب درسیہ ختم کیں۔ اسی دور میں ان کی شادی ہو گئی۔ لیکن شادی سے ان کی تحصیل علم کے ذوق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ علم حدیث کی تکمیل کیلئے وہ دہلی چلے گئے۔ اور اس دور کے مشہور محدث و عالم مولانا نذیر حسین کی خدمت میں رہ کر اپنی علمی پیاس بجھائی لکھنؤ واپس آنے کے بعد انھوں نے اپنے طور پر انگریزی پڑھنا شروع کی اور بقدر ضرورت اس زبان سے واقفیت حاصل کر لی۔ شرر کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت کی راہ سے ہوا منشی احمد علی کسمنڈوی کی صحبت میں انھوں نے بھی اخبارات میں مضامین لکھنا شروع کئے ۱۸۸۰ء میں منشی نول کشور نے انھیں اودھ اخبار کے

اڈیٹوریل اسٹاف میں لے لیا شرر ذہانت اور پبلک کے مذاق کے بڑے نباض تھے انہوں نے لطیف خیال آرائی کو سادہ اور دلکش اسلوب بیان کے ساتھ کچھ ایسے قبول طبیعت انداز میں سمویا کہ پورے ملک میں انکی مضمون نگاری کی دھوم مچ گئی۔ اسی زمانے میں انہوں نے "محشر" کے نام سے ایک ہفتہ وار رسالہ نکالا۔ محشر کے صفحات پر شرر کا اسلوب زیادہ نکھرے ہوئے انداز میں نمایاں ہوا۔ اور بہت مقبول ہوا۔ ناول نگاری کا سلسلہ بھی اسی دور میں شروع ہوگیا۔ ۱۸۸۷ء میں انہوں نے اپنا مشہور ماہ نامہ "دلگداز" جاری کیا۔ جو وقفوں کے ساتھ انکی زندگی کے بعد بھی نکلتا رہا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ حیدرآباد چلے گئے۔ اور وہیں ۱۸۹۵ء میں وقار الامرا کے لڑکوں کے اتالیق کی حیثیت سے انگلستان گئے جہاں انہوں نے فرنچ زبان سے واقفیت حاصل کرلی۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا حیدرآباد سے لکھنؤ واپس آگئے اور باقی پوری زندگی علم و ادب کی خدمت میں صرف کردی۔ دسمبر ۱۹۲۶ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

شرر بڑے ذہین، محنتی اور حوصلہ مند انسان تھے۔ قلم کی روانی کا یہ عالم تھا کہ ہزاروں صفحات پر مضمون نگاری کے دریا بہادیے۔ تاریخ، سوانح مذہب، اصلاحی، علمی، ادبی مسائل، ادب لطیف، ناول ان کی جولانی قلم کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مطالعہ وافر۔ حافظہ قوی اور قوت آخذہ بہت تیز تھی۔ بلاتکلف لکھتے اور خوب لکھ ڈالتے۔ نظر کم کرتے تھے اور اس کا لحاظ نہیں رکھتے تھے کہ ادبی تخلیق کمانی مشاقی تحریر کے معیار سے کہیں بلند درجے کی چیز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف کا بیشتر حصہ صرف اپنے دور کی چیز ہوکر رہ گیا ہے۔ لیکن جہاں کہیں خیال کی راہیں وجدان کے نکہت زاروں سے ہوکر گذری ہیں۔ قلم میں بلا کی تاثیر پیدا ہوگئی ہے۔ حب وطن، باغ آرزو، لوٹا ہوا کھنڈر، بزم قدرت، اعلیٰ پایہ کے تخلیقی مضامین ہیں۔

ان کے بعض تاریخی مضامین اور تاریخی کتابیں تلاش وتحقیق امور خانہ کاوش وحسن فن کا بہت عمدہ نمونہ ہیں۔ عام طور سے شرر کی نثر بہت سادہ اور بے تکلف اظہار خیال کی شان سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ کہیں کہیں پھیکا پن اور بے نمکی بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔

شرر کو سب سے زیادہ امتیاز ایک ناول نگار کی حیثیت سے ہوا۔ نذیر احمد اور سرشار کے بعد وہی اس میدان کے سب سے بڑے شہسوار تھے۔ انہوں نے ناول کی بیرونی ساخت میں مغربی فن کے اثرات کو زیادہ سلجھے ہوئے انداز میں نمایاں کیا۔

ان کے یہاں پلاٹ کا واضح تصور ملتا ہے اور واقعات کی ترتیب میں نظم وربط کی باقاعدگی نظر آتی ہے۔ مناظر کی مصوری بھی بڑے دلچسپ انداز میں کرتے ہیں اردو میں تاریخی ناول نگاری کی بنیاد رکھنے کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔ ان کے ناولوں نے تاریخ اسلام کے بہت سے اہم اور نتیجہ خیز واقعات کو رومانوی تخئیل کا رنگ دے کر عام معلومات کے دائرے میں پہنچا دیا۔ شرر نے فخر ماضی کے اس احساس کو عوامی مقبولیت دیدی۔

جسے شبلی نے بلند آہنگ علمیت وتاریخیت کے ساتھ شروع کیا تھا۔ شرر کے ناولوں میں بعض بڑے زبردست قسم کی کمزوریاں ہیں۔ کردار نگاری کا انہیں کوئی خاص سلیقہ نہیں۔ مکالمے کہیں کہیں بالکل بے جان ہو جاتے ہیں۔

ناول نگاری بعض اوقات واقعہ نویسی بن جاتی ہے۔ . . . . . . . . لیکن ان تمام نقائص کے

باوجود شرر کی ادبی حیثیت اور خدمات سے انکار ممکن نہیں ہے۔ انکی بعض ناولیں فن کا بہت اچھا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ فردوس بریں، ایک زندہ جاوید افسانوی تخلیق ہے منصور موہنا۔ ایام عرب، زوال بغداد، فلورنڈا، بھی بڑے دلچسپ مطالعے کی چیزیں ہیں۔ انہوں نے اصلاحی اور سماجی ناول بھی لکھے اس ضمن کی کتابوں میں طاہرہ اور حسن کا ڈاکو خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

شرر کی بعض اہم تصانیف یہ ہیں۔ تاریخ اسلام، تاریخ سندھ، تاریخ ارض مقدس، فردوس بریں۔ طاہرہ حسن کا ڈاکو۔ ایام عرب، زوال بغداد، منصور موہنا، فلورا فلورنڈا۔ عاشقانہ خیال تاریخی اور علمی مضامین کے وہ مجموعے جنہیں مبارک علی نے کئی جلدوں میں شائع کر دیا ہے۔

# منشی سجاد حسین

ولادت — سنہ ۱۸۵۶ء | وفات — سنہ ۱۹۱۵ء

اردو کے مشہور ہفتہ وار اخبار اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین نے افسانوی ادب میں ایک نئے رنگ کا اضافہ کیا وہ بڑے ذہین، زبان و بیان کے دولت کے بڑے ماہر اور بڑے ظریف طبیعت انسان تھے۔ انہوں نے دلچسپ قہقہہ خیز انداز میں ناولیں لکھ کر۔ افسانوی ادب میں ظریفانہ رنگ کا ایک ممتاز مقام پیدا کر دیا۔ سجاد حسین کی نگاہ حماقت، سادہ لوحی اور تمسخر کے مناظر کی تلاش ماہرانہ گہرائی کے ساتھ کرتی ہے۔ اور لکھنؤ کی نکھری ستھری دلکش زبان میں ان مناظر کی قہقہہ خیز مصوری سونے پر سہاگہ بن جاتی ہے۔ ان کا مشہور ناول "حاجی بغلول" نئی حیثیت سے بہت دلچسپی کی چیز ہے۔ اس ناول میں بہت جاندار کردار نگاری ملتی ہے سرشار کے فوجی کے بعد سجاد حسین

سجاد حسین کا حاجی بغلول سخرگی کا سب سے زیادہ دلکش پیکر پیش نگاہ کر دیتا ہے۔ حاجی بغلول کے علاوہ طرحدار لونڈی، کایا پلٹ، میٹھی چھری، احمق الدین وغیرہ۔ ان کے بہت دلچسپ ناول ہیں۔ سجاد حسین کی کوشش نے اودھ پنچ کو اپنے دور کا ایک معرکہ آرا اخبار بنا دیا تھا۔ اودھ پنچ کی بدولت جدید اردو ادب کو بعض چوٹی کے ارباب فن میسر آ گئے۔ اکبر الہ آبادی کی ظرافت کا سطح ظہور اودھ پنچ ہی تھا۔ ادب کی تاریخ میں سجاد حسین کی صحافتی خدمات ناقابل فراموش حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔

# محمد ہادی رسوا

اردو ادب کی تاریخ رسوا کے ساتھ اعلیٰ معیار کی تخلیق روایت وابستہ ہے۔ رسوا کے فن نے افسانہ نگاری کی ایک نئی راہ قائم کی۔ مرزا محمد ہادی نام رسوا تخلص تھا۔ ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے مرزا کے خاندان میں بہت ستھرے قسم کا علمی ماحول تھا۔ مرزا صاحب نے فارسی کی درسی کتابوں کے علاوہ حساب نجوم اور اقلیدس وغیرہ کے علوم بھی اپنے والد سے حاصل کیے بعد میں بڑے شوق و محبت سے عربی کی تحصیل کی انٹرنس کا امتحان پرائیوٹ پاس کیا۔ پھر رڑکی سے اوور سیری کا امتحان پاس کیا۔ بلوچستان میں کچھ دنوں ریلوے میں ملازمت بھی کی۔ لیکن علمی ذوق نے بہت جلد یہ راہ ترک کرادی لکھنؤ واپس آ گئے۔ اور اب کیمسٹری کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا۔ لندن سے اس کے لیے ضروری سامان بھی منگوائے پنجاب یونیورسٹی سے پرائیوٹ بی۔ اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اور امریکہ کی اورنیٹل یونیورسٹی سے پی ایچ، ڈی کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔ بلوچستان سے لکھنؤ لوٹ کر پہلے نخاس مشن اسکول میں فارسی

کے مدرس ہوگئے تھے۔ پھر کرسچین کالج لکھنؤ اور شیعہ کالج لکھنؤ کے اسٹاف میں رہے۔
آخیر عمر میں دارالترجمہ عثمانیہ میں تقرر ہوگیا تھا۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو انتقال ہوا۔
رسوا کی ذہانت، قابلیت، وسعت مطالعہ اور نظر کی گہرائی پر حیرت ہوتی ہے۔ فلسفہ ان کے مذاق کی چیز تھی۔ طبیعات سے بھی خاصا شغف پیدا کرلیا۔ ریاضی کے بڑے ماہر تھے، عربی، عبرانی، انگریزی، ہندی اور سنسکرت وغیرہ زبانوں پر اچھا خاصا عبور تھا۔ مرزا کی ہمہ دانی بمشکل ہی کسی دوسرے ادیب کے یہاں ڈھونڈی جاسکتی ہے۔ فلسفی، منطقی، ریاضی داں اور ماہر السنہ ہونے کے ساتھ ساتھ مرزا رسوا اچھے پائے کے شاعر بھی تھے۔ وہ صاحب فن ادیب بھی پوری زندگی تصنیف وتالیف کی نذر رہی بلا کے خوددار اور مزاج کے مستغنی اور خیال کی دنیا میں مست مگن رہنے والے تھے۔ طبیعت میں ایک قسم کی بے پروائی بھی آگئی تھی۔ جو لکھا خود اس کی قدر نہ کی کلام کا بیشتر حصہ ایسا منتشر ہوا کہ اب اوراق پریشان کو جمع کرنا کارے دارد کی چیز ہے۔
نثر میں رسوا کی جولانی قلم، فلسفہ، مذہبیات، طبیعات غرض مختلف موضوعات پر رہی۔ لیکن ادبی نقطہ نظر سے انکا خاص امتیاز ایک نادر فنکار کی حیثیت سے ہے۔ ذات شریف، شریف زادہ، افشائے راز ولاالعدا ناولیں انکے زور قلم کا نتیجہ ہیں لیکن ناول کی دنیا میں زندۂ جاوید امتیاز حاصل کرنے والی ان کی تصنیف "امراؤ جان ادا" ہے، رسوا نے اپنے مزاج کے خلاف ناول نگاری کو سنجیدگی اور وقار کے اعلیٰ معیار پر پہونچا دیا۔ رسوا کو وہ ملکہ تھی جو انسانی فطرت کے گہرے مطالعہ کا وقت طلب فریضہ بڑے سیدھا پن اس کے ساتھ انجام دے لیتی ہے۔ سنسنی خیز میں خون کو تیزی سے حرکت میں لانے والا حالات اور شکوہ بیان کی خاطر لفظی بازی گری سے رسوا کو دور کا بھی لگاؤ نہ تھا ان کے فن کی دنیا میں مشاہدات،

دیگر بات گہری فکر کی آنچ میں کھپا کر لذت ہی جلیہ اور روپ اختیار کرتے ہیں۔ اور بحیثیت فنکاری کی شان سے سطح پر ظہور آتے ہیں۔ رسوا نے عام زندگی کے واقعات کو فنکارانہ حقیقت پسندی کے ساتھ پیش کرنے کا ایک خاص سلیقہ پیدا کر دیا۔ وہ اپنے پلاٹ کیلئے شہروں شہروں کی خاک نہیں چھانتے ان کے زیادہ تر افسانے سوا لکھنؤ سے متعلق ہیں۔ رسوا کے یہاں مختلف طبقات کی زندگی کی مصوری ہے۔ اور فن چابکدستی کا عمل ہر جگہ یکساں زور و قوت کے ساتھ سرگرم کار رہتا ہے۔ رسوا فن کا بہت واضح اور روشن شعور رکھتے تھے۔ انہوں نے جگہ جگہ اپنے اصول بھی بیان کر دیئے ہیں۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے بڑی خوبی سے اپنے اصولوں کو برتا ہے۔ رسوا کا اسلوب نگارش پر تاثیر سادگی کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ لکھنؤ کی ٹکسالی زبان پر رسوا کے فلسفیانہ ذہن کا عمل اتنا حسین اور لطیف ہوا کہ اس میں موقع اور محل کے لحاظ سے بھرپور اظہار کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔ اس انداز تحریر کا اثر یہ ہے کہ ان کے یہاں سماں بندھ جاتا ہے۔ دل میں نغمۂ جاں نواز بن کر اتر جانے والی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے رسوا کی نثر نگاری ادبی حیثیت سے بڑی جوہر دار روایات کی حامل ہے۔

رسوا کا فن امراؤ جان ادا میں نقطۂ کمال پر پہنچ گیا ہے۔ مختصراً یہ ایک طوائف کی آپ بیتی ہے لیکن اس آپ بیتی میں گہرے نفسیاتی مطالعے کا انداز جذبات کی لطیف مصوری کی وہ شان، ماحول کی عکاس کشی کی وہ کیفیت معرت کے وہ دلدوز مناظر۔ درسخن دل کی پذیرائی کا وہ حسین اہتمام ہے کہ یہ تصنیف اردو کے افسانوی ذخیرے کی ایک شاہکاری ادبی تخلیق ہو گئی ہے، رسوا نے افسانہ نگاری کے فن کو مغرب کی غیر تخلیقی تقلید کے پھندوں سے آزاد کر دیا۔ امراؤ جان ادا اس کی روشن مثال ہے۔

ولادت سنہ ۱۸۷۰ء

# راشد الخیری

وفات ۱۹۳۶ء

نذیر احمد نے قصوں کے ذریعہ اصلاح معاشرت کی جو ادبی راہ نکالی تھی راشد الخیری نے اسے خصوصی توجہ اور انہماک کے ساتھ اپنا لیا۔ قدیم مشرقی شرافت کی وہ جیتی جاگتی تصویر تھے۔ ہندوستان کے طرز معاشرت کی خوبیوں سے انھیں دلی شغف تھا۔ مغرب کی تقلید اور فیشن پرستی سے انھیں تنفر تھا۔ زندگی کے موتی انھیں حیا کے پسینے کی بوندوں میں نظر آتے تھے۔ انہوں نے عورتوں کی زندگی کو اپنے افسانوں کا خصوصی موضوع بنایا اور عورتوں کی اصلاح و ترقی اور خانگی زندگی کی فلاح و درستی کے لیے قلم کی قوتیں وقف کر دیں مسلمانوں کے متوسط گھرانوں کی معاشرت، طور طریق، بول چال اور گھریلو قصیوں کے مناظر کی بڑی دلکش تصویر ان کے یہاں ملتی ہے۔

مغربیت ایک سیلاب بن کر مشرقی جوہر شرافت کو بہائے لیے جا رہی تھی۔ یہ نظارہ راشد الخیری کے سینے میں درد حسرت کی چیخ بن کر ابھرتا ہے۔ ان کے قصوں میں عام طور پر غم انگیز ماحول ملتا ہے۔ جو بعض اوقات اس قدر شدید ہو جاتا ہے کہ تصور کانپنے لگتا ہے وہ مصور غم کے لقب سے مشہور ہیں اس میں شک نہیں کہ انھیں جذبات بالخصوص عورتوں کے جذبات کی مصوری میں زبردست کمال حاصل ہے لیکن بعض اوقات غم و حسرت کے رنگ میں اس قدر تیز اور لفظوں کے غلو سے اتنے گہرے ہو جاتے ہیں کہ نفس واقعہ سے انھیں کوئی ربط نہیں رہتا۔۔۔

راشد الخیری کے یہاں تبسم خندہ جبینی اور شادمانی کے مناظر ناپید تھا۔ نذیر احمد کے مقابلے میں ان کا دائرہ محدود ہے۔ ان کے یہاں فن کی وہ چابکدستی بھی نہیں ہے جس نے نذیر احمد کو زندگی کا بہت کامیاب ترجمان نقاد اور مصلح بنا دیا۔

راشد الخیری کی تصانیف نے گھر میں بیٹھنے والی عورتوں کی شائستہ تعلیم و تربیت میں نمایاں حصہ لیا۔ اور انکی یہ خدمت لائق تحسین ہے۔

ولادت سنہ ۱۸۸۰ء

# پریم چند

وفات سنہ ۱۹۳۷ء

اردو افسانہ نگاری کی تاریخ میں پریم چند غیر فانی عظمت اور لازوال شہرت کے مالک ہیں۔ انہوں نے ایک عہد آفرین شان کے ساتھ افسانے کے میدان میں قدم رکھا اور ادب و زندگی کے رابطے کو زبردست فنی مہارت کے ساتھ نمایاں کرکے اردو افسانہ نگاری میں انقلاب پیدا کر دیا۔ ان کی تصنیف میں فنکار کی دلسوزی، خلوص اور سچی انسانی تڑپ ایک موثر انداز میں جلوہ گر ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ابھرنے والے انقلابی تصورات زندگی کو پریم چند نے فکر کے مجتہدانہ عمل سے بہت دلکش ادبی روپ دے دیا ہے ان کے فن پاروں میں ہمارا پورا سماج نمایاں ہو کر سامنے آگیا ہے۔ پریم چند انسانی فطرت کے بڑے گہرے بناض تھے زندگی کا وہ بہت بلند اخلاقی تصور رکھتے تھے۔ انھیں ہندوستان کی تہذیب سے محبت تھی جہالت، تنگ نظری تعصب اور بے جان رواج پرستی کے وہ شدید مخالف تھے۔ وہ حب الوطنی کے جذبہ سے معمور اور ملک کی ترقی و خوشحالی کے سچے خواہاں تھے انہوں نے فن کے تقاضوں کا پورا لحاظ کرتے ہوئے بڑی حسن کاری اور چابکدستی کے ساتھ آرٹ کو زندگی اور اصلاح کا وسیلہ بنا دیا ہے۔ ہمارے زمانے میں جب ادب برائے زندگی کا نظریہ بیشتر حالتوں میں سطحی قسم کے پروپیگنڈا لٹریچر کی پیداوار کا ذریعہ بن گیا ہے پریم چند کا آرٹ صحیح منزل کی رہنمائی میں چراغ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

پریم چند نے ناول بھی لکھے اور مختصر کہانیاں بھی۔ افسانے کی تکنیک

پر انہیں حاکمانہ عبور حاصل تھا۔ زندگی کے عام واقعات سے وہ بہت خوبصورتی کے ساتھ پلاٹ اخذ کر لیتے ہیں۔ پریم چند کا خاص میدان دیہاتی زندگی تھی۔ انھوں نے بظاہر اس سادہ سپاٹ غیر دلکش زندگی میں اپنے گہرے مطالعے اور زبردست مصورانہ کمال سے نفسیات کی ایک دنیا نمایاں کر دی ہے۔ پریم چند کے مرقعے میں انسانی زندگی کے مختلف پہلو گہرے حسن آفرین اثر کے ساتھ نمایاں ہو جاتے ہیں ان کے افسانوں میں فطری سادگی اور بے ساختگی ہے۔ واقعات از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور بغیر کسی تکلف کے خوشگوار ترتیب کی لڑی میں پرو جاتے ہیں۔ پریم چند نے مکالموں کو بلند فنی مہارت کے ساتھ برتا ہے۔ ان کے مکالمے کرداروں کی سیرت بڑے لطیف اور دلکش انداز میں نمایاں کرتے ہیں۔ گفتگو میں موقع و محل کا پورا لحاظ اور جذبات و خیالات کی پوری رعایت ہوتی ہے۔ انہوں نے موثر طریقوں سے ہندوستانی تہذیب کی روحانی عظمت کو اجاگر کیا ہے، ماضی کے روشن پہلو ان کے افسانوں میں موتیوں کی طرح پڑے دمکتے ہیں۔ پریم چند کی زبان کا خاص وصف پر تاثیر سادگی ہے۔ وہ ستھری رواں اور عام فہم زبان لکھتے ہیں۔ انھیں ہندی اور دونوں پر یکساں قدرت تھی۔ دونوں کے خوشگوار میل ملاپ سے انہوں نے اپنی تحریر میں بلا کی لچک، مٹھاس اور تاثیر پیدا کر دی۔ پریم پچیسی، پریم بتیسی، پردہ مجاز، گئو دان، واردات، بیوہ، زادِ راہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔

# علی عباس حسینی

دورِ جدید کے افسانہ نگاروں میں علی عباس حسینی نے ایک خاص امتیاز حاصل کر لیا ہے۔ حسینی بہت ستھرا علمی مذاق رکھتے ہیں۔ انہوں نے عوامی زندگی کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا ہے۔ اور ادبی دلکشی کے ساتھ سماجی مسائل کو موضوعِ فن بنا لیا ہے۔ ان کی طبیعت فطری طور پر افسانہ نگاری کے لئے موزوں ہے وہ نفسیاتی رنگ میں اپنے کرداروں کی سیرت نمایاں کرتے ہیں اور جزئیات کی جاندار مصوری سے کہانی میں دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی زبان بامحاورہ، عام فہم اور موقع و محل کے اعتبار سے پر تاثیر اور عقیدہ انگیز ہوتی ہے۔ وہ ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ بڑی مہارت سے برتتے ہیں۔ ان کے مزاج میں ذہن کی شگفتگی کا ایک نکھرا ہوا لطیف رنگ ملتا ہے۔ جو تحریر میں چاشنی اور نکھار پیدا کر دیتا ہے۔

حسینی اردو ادب پر بہت وسیع نظر رکھتے ہیں ان کی مشہور تصنیف "ناول کی تاریخ و تنقید" اپنے موضوع پر بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز مطالعہ کی چیز ہے۔ حسینی کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جدید افسانہ نگاری میں ان کی انفرادیت بہت نمایاں اور ممتاز ہے۔

## سجاد حیدر یلدرم

ولادت ۱۸۸۰ء — وفات ۱۹۴۳ء

یلدرم نے خیال کی رنگینی و لطافت اور زبان کی شاعرانہ سحر طرازیوں سے افسانوی فن میں ادبِ لطیف کا رنگ بہت اجاگر کر دیا ہے۔ انھیں ترکی زبان سے بہت شغف تھا۔ اور انہوں نے اعلیٰ پایہ کی تخیلی جدت اور معنویت کے ساتھ ترکی افسانوں کو اردو کا قالب پہنایا۔ ان کی اجتہاد پسند طبیعت نے لطافتِ بیان کے لئے نئی نئی ترکیبیں شعور ذہنی صنعت گری کے ساتھ ایجاد کیں۔ یلدرم کے ترجمے اور

بجٹبیل تصنیف کی شان رکھتے ہیں۔ یلدرم کے افسانوں میں گہرے اور نازک جذبات
کی بہت خوبصورت نفسیاتی تحلیل ملتی ہے کردار کے کرشمہ ساز پہلوؤں میں ڈوب
کر مطالعہ کے لطیف نکتے ابھار دینے کا انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ وہ قلم کے
لطیف اور سحر طراز جنبشوں سے ایک فضا تیار کر دیتے ہیں۔ جس میں ذہن کیلئے
وجد، رقص، انبساط کے خزانے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یلدرم نے ادب
لطیف کو مذاق کی فلسفیانہ شائستگی اور زبیرہ توانا گرمی شباب کے ساتھ برتا
ہے۔ ان کی مشہور تصنیف "خیالستان" اپنے طرز کی ایک بہت اعلیٰ تصنیف
ہے۔

## کرشن چندر

نئے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر کے فن کو زبردست مقبولیت حاصل
ہوئی ہے۔ کرشن چندر نے خیال و بیان کے لطیف رعنائیوں کے ساتھ اپنی
انفرادیت کو افسانے کے پیکر میں نمایاں کیا ہے۔ زندگی کی تلخی پر انکی نگاہ بہت
گہری پڑتی ہے۔ وہ فکر انگیز انداز میں موجودہ سماجی کشمکش کی مصوری کرتے
ہیں۔ ان کے فن میں انسانی زندگی اور سیرت کے مختلف پہلو اثر آفریں شدت
کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ منظر نگاری میں کرشن چندر کو خاص کمال حاصل ہے۔
وہ شاعرانہ رنگینی بیانی کے ساتھ مظاہر فطرت کی مصوری کرتے ہیں۔ اور اپنے
قلم کی لطیف جنبشوں اور دلکش عبارت آرائی سے ایک سماں پیدا کر دیتے
ہیں۔ کردار نگاری میں وہ نفسیاتی تجزیہ کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔ کرشن
چندر ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم رکن ہیں۔ تنگ نظر سماج کے
ظلم ناانصافی جھوٹی مذہب پرستی کی حیوانیت اور سرمایہ دار نظام کی

کاروباری خود غرضی کو انہوں نے اپنے فن میں رومانی و حقیقت کی دلکش آمیزش حسین ادبی آرائشوں کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔ کرشن چندر کے ادبی کارناموں میں جدید اردو افسانے کو ترقی کی راہ پر بہت آگے بڑھایا۔ ان کے مشہور ناول "شکست" نفسیاتی کردار نگاری احسن آفریں خیال آرائی اور فرقہ پرست سماج کے مظالم کی عبرت انگیز مصوری کا ایک حسین ادبی شاہکار ہے۔ تقسیم ہند کے بعد رونما ہونیوالی سفاکانہ خون ریزیوں پر کرشن چندر کی افسانوی تخلیق "ہم وحشی ہیں" ایک یادگار کارنامہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے

اردو ادب کے اس مختصر تاریخی جائزے میں نئے دور کے تمام ممتاز افسانہ نگاروں کے فن کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لینے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے دور میں شاعری کے بعد سب سے زیادہ توجہ افسانہ پر صرف ہوئی ہے اور لکھنے والوں کی ایک خاص تعداد پیدا ہو گئی ہے۔ جس نے مغربی اثرات اور نئے ادبی نفسیاتی رجحانات کی روشنی میں، افسانوی ذخیرے کو نمود و امتیاز کے ساتھ مالامال کیا ہے۔ اپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، دیوندر ستیارتھی۔ سعادت حسین منٹو۔ خواجہ احمد عباس، حیات اللہ انصاری، عصمت چغتائی۔ عزیز احمد، اور قرۃ العین حیدر کے نام خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

# طنز و مزاح

## فرحت اللہ بیگ

مرزا فرحت اللہ بیگ ان چند ادیبوں میں تھے جنہوں نے دہلی کی بامحاورہ ٹکسالی زبان کو بھرپور ادبی وقار کے ساتھ برتا ہے۔ فرحت اللہ بہت خوش مذاق آدمی تھے شگفتگی اور لطافت ان کی طبیعت میں امتیاز کے ساتھ نمایاں نظر آتے ہیں۔

ان کا مزاج لطیف، تبسم کے مواقع بہت خوشگوار انداز میں پیدا کرتا ہے۔ فرحت اللہ کی تحریریں شوخی طبیعت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہیں۔ بیان پر انہیں زبردست قدرت حاصل ہے۔ وہ تفصیل میں بھی حسن بیان اور انشا کے لطافت پوری آب و تاب کے ساتھ برقرار رکھتے ہیں اور بڑے مزاح اور ظرافت کے پہلو نکالتے جاتے ہیں۔ زبان پر فرحت اللہ بیگ کو بلا کی قدرت حاصل ہے وہ محاورات کو بڑی مشاقی اور لطافت کے ساتھ اپنی تحریروں میں کھپاتے ہیں۔ فرحت اللہ الفاظ کی دلکشی بیان کی روانی اور لطیف شگفتہ نگاری سے ایک عالم پیدا کر دیتے ہیں جس میں طبیعت کو حقیقی انبساط حاصل ہوتا ہے۔

ان کا مشہور مضمون "دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ" جو اب کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اردو ادب میں اپنے طرز کی بہت بلند پایہ چیز ہے اس میں وہاں مرحوم کے شاعروں کی معاصرات، انداز طبیعت، شاعروں کے آداب اور خصوصی دہلی کی ادبی زندگی کی بہت جاندار روشن اور فکر انگیز تصویر ملتی ہے۔

پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم آج سے سو برس پہلے غالب اور مومن کے آداب آفریں ماحول میں پہنچ گئے ہیں۔ اور ذہنی لطافتوں کے منظر یکے بعد دیگرے نگاہ و

کی توضیح کر رہے ہیں۔

انکا مشہور مضمون "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی" اعلیٰ معیار کی تصنیفی شان رکھتا ہے۔ فرحت اللہ کے شگفتہ نگار قلم نے اپنے استاد کی سیرت و شخصیت کی اتنی دلکش تصویر کھینچی ہے۔ کہ پڑھنے والا بے اختیار وجد کرا اٹھتا ہے۔

# پطرس

اردو ادب کے مزاح نگاروں میں پطرس کا نام ایک خاص امتیاز رکھتا ہے پطرس انگریزی کے ایک اچھے ادیب تھے۔ انہوں نے مغربی طنز و مزاح کا بہت گہرا مطالعہ کیا اور دلکش فنی چابکدستی کے ساتھ انگریزی اثرات کو اپنے اردو کے مزاحیہ مضامین میں نمایاں کیا۔ پطرس واقعات کی عکاسی ایسے فطری انداز میں کرتے ہیں کہ بے ساختگی کے ساتھ مزاح کا پہلو ابھرتا ہے۔ پطرس کے افسانوں میں انسانی سیرت کا بہت گہرا نفسیاتی مطالعہ ملتا ہے۔ انکی کردار نگاری بڑے معیار کی ہوتی ہے۔ اور فن کی نازک صناعی کا بہت اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔ پطرس کے فن میں تمسخر اور مضحکہ کو دخل نہیں۔ وہ بڑی ہمدردی کے ساتھ زندگی کے مزاح انگیز پہلوؤں کی مصوری کرتے ہیں اور پڑھنے والوں کے لئے شائستہ تبسم کا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ پطرس کے پلاٹ پیچیدہ نہیں ہوتے سامنے کی باتوں کو کر انکا زاویۂ نگاہ سے وہ ان میں حسن و دلکشی کے پہلو بڑی خوبصورتی سے پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کی زبان سادہ، رواں اور دلکش ہوتی ہے۔ شگفتگی اور لطافت ان کے اسلوب بیان میں زور اور تاثیر پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ اردو کی بدنصیبی ہے کہ پطرس نے بہت کم لکھا ہے۔ ان کے مضامین کا ایک مختصر مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ چند مضامین ان کے علاوہ بھی انھوں نے لکھے ہیں۔ یہ ہے پطرس کی کل کائنات تخلیق لیکن جدید مزاحیہ ادب میں انکا مرتب

بہت بلند ہے۔

# رشید احمد صدیقی

ہمارے مزاح نگاروں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا انداز بہت بلند انفرادی امتیاز رکھتا ہے۔ انہوں نے طنز کو اعلیٰ مہارت فن کے ساتھ زندگی کی تنقید کے لئے بھی برتا ہے اور اصلاح کے لئے بھی۔ ان کا طنز اس قدر جاندار اور بھرپور ہوتا ہے کہ دل اور دماغ پر اس کے نہ مٹنے والے اثرات قائم ہو جاتے ہیں۔ رشید احمد صاحب کا انداز گہرے طور پر علمی ہے۔ ان کے مزاح کو سمجھنے اور صحیح طور پر اس سے لطف اٹھانے کے لئے مطالعہ اور نظر کی ضرورت ہے تاریخ فارسی اور اردو شعر و ادب جدید علوم و فنون علمی اور وطنی سیاست انسانیت کی تہذیبی و تمدنی روایات پہ ان کی نگاہ بڑی سرعت اور بڑے بھرپور انداز میں فکر و خیال کے بہت وسیع دائرے میں پھیر جاتی ہے۔ بہت بے تکلفی سے باتوں باتوں میں لطیف رمز و کنائے کے انداز سے وہ زندگی کے انبساط خیز پہلوؤں کی مصوری کرتے جاتے ہیں۔ اور فکر انگیز نکتے ابھارتے جاتے ہیں۔ معمولی سے معمولی موضوع پہ بھی ان کی لطافت فکر اعلیٰ ذہنی تفریح کا سامان فراہم کر دیتی ہے رشید صاحب کا انداز بیک وقت فلسفیانہ بھی ہے۔ اور لطیف بھی فلسفے کی خشکی کا ان کے یہاں گزر نہیں اور لطافت کبھی بے محابا قہقہہ بننے نہیں پاتی یہی ان کے فن کا کمال ہے ان کی زبان حسین ادبی آرائشوں سے بہرہ ور ہوتی ہے اور ذہن کی رچی ہوئی شائستگی کو وہ بڑے نکھرے ہوئے انداز میں نمایاں کرتی ہے مزاحیہ مضامین کے علاوہ رشید صاحب نے شعر و ادب پہ بلند پایہ تنقیدیں بھی لکھی ہیں۔ مزاحیہ ادب پہ ان کا تحقیقی و تنقیدی

مقالہ ملفوظات، و مضحکات، ماہیر حاصل تاریخی جائزہ اور بلند متوازن تنقیدی معیار کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش نگاہ کر دیتا ہے۔ ان کی سوانحی مضامین کا مشہور مجموعہ "گنجہائے گراں مایہ" ادبی حلقوں میں غیر فانی امتیاز حاصل کر چکا ہے۔ "آشفتہ بیانی میری" اور "ہم نفسانِ رفتہ" ان کی حال کی تصانیف ہیں۔

# شوکت تھانوی

پچھلے پچیس تیس برس کے عرصہ میں شوکت تھانوی کے مزاح نگار قلم نے ہمارے مزاحیہ ادب میں قابل قدر اضافہ کیا ہے اثر آفریں انداز میں ہنسنا ہنسانا ایک فن ہے۔ اور شوکت کو اس فن کا اچھا سلیقہ حاصل ہے۔ زود نگاری ان کا ایک ممتاز وصف ہے وہ معمولی باتوں اور روزمرہ کے عام واقعات کو بڑے ظریفانہ اور لطف خیز انداز میں پیش کرتے ہیں۔ رسم و رواج سماجی کمزوریوں اور انسانی برتاؤ کے مضحکہ خیز پہلوؤں پر ان کے یہاں بہت دلچسپ تبصرے ملتے ہیں۔ شوکت کی زبان عام فہم اور رواں ہے اور تکلیفات سے عالم ہوتی ہے۔ ان کے خیال و بیان دونوں میں بے ساختگی کی ایک دلکش نمود ملتی ہے۔ واقعات کو ایسی ترتیب سے اور ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ سنجیدہ سے سنجیدہ آدمی بھی تبسم بہ لب ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی ان کے فن کی کامیابی کا راز ہے اور اسی لئے ان کی تحریروں کو زبردست عوامی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ "سودیشی ریل" "دل پھینک" "بر بھس" "طوفانِ تبسم" "سیلاب تبسم" ان کی چند کتابیں ہیں۔ ان کی تصانیف میں "شیش محل" کو نمایاں امتیاز حاصل ہے۔ شیش محل میں شوکت نے اپنے احباب و شناساؤں کی سیرت پر بڑے دلچسپ اور لطف انگیز انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔

# کنہیا لال کپور

طنز و مزاح کو کنہیا لال کپور نے متنوع زندگی کے تعمیری مقصد کے لئے واضح ادبی انفرادیت کے ساتھ برتا ہے۔ کپور کے مشاہدۂ فکر کا دائرہ بہت وسیع ہے سیاسی، سماجی ادبی غرض زندگی کے مختلف گوشوں پر ان کی نظر پڑتی ہے۔ اور وہ لفظی صنائع و حسن کاری کے ساتھ نشتر طلب پہلوؤں کو اجاگر کر دیتے ہیں۔ کپور کے فن میں آمد و بے ساختہ پن کا جوہر بہت نمایاں رہتا ہے۔ وہ بہت بے لاگ اور اپنے طرز خاص میں بھرپور انداز میں لکھتے ہیں۔ کپور نے نمود کمال کے ساتھ طنز نگاری کی راہ میں اپنی ذہنی انفرادیت کو نمایاں کیا ہے۔ "اردو افسانہ نویسی کے چند نمونے" اور "غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں" کپور کے ان مضامین میں ہیں۔ جو ان کے اسلوب مزاح نگاری کے حقیقی جوہر کو پورے طور پر نمایاں کر دیتے ہیں۔ کپور بہت سادہ رواں اور شستہ ادبی زبان لکھنے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے آرٹ پر عزیز احمد کا تبصرہ بہت جامع ہے عزیز احمد لکھتے ہیں "ترقی پسند تحریک نے صرف ایک اچھا ظریف اور مزاح نگار پیدا کیا ہے۔ کنہیا لال کپور۔ ان کی مضحک نگاری میں جو قوت ہے وہ سنجیدہ سے سنجیدہ تنقید اور سخت سے سخت تنقید میں نہیں۔"

"سنگ و خشت" "چنگ و رباب" "نوک نشتر" اور "شیشہ و تیشہ" ان کے افسانوں اور مضامین کے مشہور مجموعے ہیں۔

# اردو زبان وادب کا مستقبل

اردو زبان کی پیدائش، ترقی وتوسیع اور ادب کے فروغ واستحکام کا جو جائزہ ہم نے پچھلے صفحات میں لیا ہے۔ وہ تشنہ رہ جائے گا۔ اگر ہم اردو زبان وادب کے مستقبل پر نگاہ کئے بغیر اس جائزے کو ختم کر دیں اردو زبان وادب کے مستقبل کا سوال آسان نہیں۔ خاصا پیچیدہ سوال ہے۔ اور طرح طرح کی پریشانیاں اور ذہنی الجھن اس کے ساتھ لپٹی ہوئی ہیں۔ سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے۔ کہ یہ سوال لسانی اور تہذیبی حیثیت سے کم اور سیاسی سطح سے زیادہ قابل غور بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس پر غور وفکر اس ٹھنڈے دل ودماغ سے نہیں ہوا ہے۔ جو سکون اور سنجیدگی کے عالم میں ممکن ہو سکتا ہے۔ سیاسی ہیجان کے پس منظر میں یہ سوال کچھ ایسے انداز میں پیش کر دیا گیا ہے۔ کہ معاملہ کی حقیقت سے ناآشنا حضرات بے تکلف اردو کے لئے موت کا حکم لگا دیتے ہیں۔ اور جو لوگ صحیح حیثیت سے باخبر ہیں وہ اپنے آپ کو بے بسی کے ماحول میں پاتے ہیں۔ اگر بات صرف اس قدر ہوتی کہ ہندوستان میں جہاں بہت سی زبانیں سمجھی اور بولی جاتی ہیں ایک زبان جو زمانے کا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ نگاہ توجہ سے گرا دی جائے تو کوئی خاص پریشانی نہیں ہوتی۔ تعمیر پذیر دنیا میں نقوش کہن برابر مٹتے رہتے ہیں۔ اور آب ورنگ کے لئے نئے نئے سامان برابر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اردو کا

معاملہ نہ ایک ایسی زبان کا ہے جو مرچکی ہو، اور اُسے کسی ہیچ وقت کے فیضان لب سے زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اور نہ وہ کوئی ایسی زبان ہے جو زندگی کے دور میں بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے رہی ہو، اور کرم و عنایت کے بل بوتے پر اِس رفتارِ زمانہ سے وابستہ رکھنے کی تدبیریں کی جا رہی ہوں۔
اردو ایک زندہ زبان ہے لاکھوں اور کروڑوں انسان اپنی سماجی زندگی میں اس کو برتتے ہیں ملک کے گوشے گوشے میں اس کے اخبارات و رسائل چھپتے ہیں۔ اس کے شاعروں کی زمزمہ سنجیاں فضائے ہند کو آج بھی گرمائے ہوئے ہیں۔ اور اس کے مفکروں و ادیبوں کی متاعِ فکر و نظر آج بھی ملک و زندگی کے فروغِ ارتقاء میں حوصلہ مندی کے ساتھ معاون ہے۔ اس مظلوم زبان کی بد نصیبی یہ ہے کہ وقت سے پہلے مصنوعی ذرائع اس پر موت طاری کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ تاکہ چند دنوں میں وہ بے حس و حرکت ہو کر رہ جائے اور یوں طفیل عمرۂ جانستان زندگی کے میدان سے بے دخل کر دی جائے۔

ہندی اور اردو کا جھگڑا تقسیم ہند سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا۔ اس کے بیج انگریزی سیاست کے چالبازوں نے آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے ہی ڈال دیئے تھے۔ انگریزی سیاست کا سارا دار و مدار اسی پر تھا۔ کہ ہندوستانی تہذیب و تمدن کے سارے معاملات ان کے اقتدار کی مصلحتوں کے مناسبت سے الجھیں جگہ پیدا کئے جائیں اور اس سے ہندوستانی زندگی کا کوئی واضح اور روشن تصور اُبھرنے نہ دیا جائے۔ ہمارے پاس اس جائزے میں اتنی گنجائش نہیں کہ اس طویل داستان سرائی کو بغیر تبصرہ ہی کی وضاحت

کے ساتھ پیش کر سکیں۔ ہندوستان کی سیاسی گتھیوں کی طرح یہ مسئلہ بھی برابر الجھتا گیا۔ اور تقسیم ہند کے بعد تو یہ ایک زبردست سیاسی انتقام کی صورت میں نمودار ہو گیا۔ عام طور پر زبان کے مسئلہ پر بحث ہوتی ہے تو اہم لسانی، تہذیبی و تمدنی سوالات کو پس پشت ڈال کر وقتی سیاسی مصلحتوں کی روشنی میں رائے قائم کی جاتی ہے اور استدلال کا سارا نظام بھی انہی مصلحتوں کی خدمت کے لئے وضع کر لیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ خواہ تشفی نفس کے لئے بہت آسان نسخہ ہو۔ لیکن علمی حیثیت سے قطعاً غیر مناسب ہے۔ زبان وقتی سیاسی ضرورتوں سے پیدا ہوتی ہے نہ ان کے سہارے پلتی بڑھتی ہے اور نہ ان کے تقاضے اس کو فنا کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔ زبان ایک عظیم تہذیبی مظہر ہے۔ جو تمدن کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کیلئے وجود میں آتی ہے۔ انھیں کے فیضان سے قوت و بالیدگی حاصل کرتی ہے۔ اور اس کی بقا و ترقی کے امکانات کا پیمانہ اس کی خدمت کی صلاحیت پر قائم ہوتا ہے۔ تقسیم کے بعد ہمارا ملک ذہن و فکر کے ایک ابتلا انگیز عبوری دور سے گذر رہا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ایسے زمانے میں جب تہذیب و تمدن کی پوری عمارت کی درستگی اور اصلاح کا سوال درپیش ہو متضاد طرح کے انتہا پسندانہ نظریات اکثر کافی زور قوت حاصل کر لیتے ہیں۔ غیر متوازن دماغ ہمہ گیر یک رنگی کو اپنا مطمع نظر بنا لیتے ہیں اور اسی مطمع نظر کو حاصل کرنے میں اپنی ساری تدبیریں صرف کرنے لگتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہمارے ملک میں بھی ہو رہا ہے تہذیبی وحدت کے نام پر اس

ہمہ رنگ اندازِ زندگی کو ختم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جو ترقی پرور زندگی کا امتیازی نشان ہوتا ہے۔ یہ کوشش نہ صرف اصولی حیثیت سے غیر دانشمندانہ ہے بلکہ ہماری ملکی تاریخ کے اعلیٰ روایات کے بالکل منافی ہے۔ ہندوستان مختلف تہذیبی وحدتوں کا گہوارہ رہا ہے۔ اور ایک رنگی کی خاطر ایسا کبھی نہیں کیا گیا کہ جلوۂ صد رنگ کو مٹا کر رکھ دیا جائے۔ رواداری، فراخ حوصلگی، سلیقہ مندانہ افہام و تفہیم اور بلند مقاصدِ حیات کے اصول کے لئے متحدہ کوششوں نے ہندوستانی زندگی میں ایک رنگی اور نقطۂ نظر کی وحدت پیدا کی ہے۔ انہیں روایات کی آغوش میں ان اقدار نے پرورش پائی ہے۔ جن پر ہم برابر فخر کرتے آئے ہیں۔ اور برابر فخر کرتے رہیں گے۔ اس میں شک نہیں کہ دو سو برس کی بدیسی غلامی نے ہمارے دماغوں کو بری طرح مسموم کر دیا ہے۔ غیر ملکی سامراج نے ہمارے درمیان اپنے سیاسی مصالح کی خاطر نفرت اور دشمنی کی آگ بھڑکا دی۔ ایسی آگ جسے خونِ معصوم کے چھینٹے بھی پورے طور پر نہیں بجھا سکے ہیں۔ برسوں ہم نے ذہنی شکنجوں میں رہ کر معاملاتِ زندگی پر غور کیا ہے۔ لیکن اب ہم آزاد ہیں ہمیں اپنی شاندار روایاتِ ماضی اور اعلیٰ ترین تصورِ مستقبل کے تحت زندگی تعمیر کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام اشتعالِ جذبات میں سر انجام نہیں پا سکتا۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے زندگی کے سوالات پر غور کرنے اور مستقبل کے دور رس تقاضوں کو وقتی مصلحتوں سے بلند و بالا رکھنے، پائیدار تہذیبی قدروں کو مذہبی اور سیاسی عصبیت سے محفوظ رکھنے سے ہی ہم ایک صحت مند نقطۂ نظر قائم کر سکتے ہیں۔ اردو کا سوال ہندوستان کی تہذیبی و تمدنی زندگی کا بہت

اہم سوال ہے، یہ زبان آج سے ایک ہزار برس پہلے اس وقت پیدا ہوئی جب مسلمان اس دیس میں آکر بسے اور ایک نئی تہذیب کی چھپن بندی کے لیے زمین ہموار ہوئی۔ آپسی ضرورتیں اس کی پیدائش کی محرک ہوئیں۔ اور مشترک کاروبار، باہمی لین دین۔ اور مختلف النوع سماجی رشتوں کے بندھنوں نے اس کے پروان چڑھنے کا بندوبست کیا۔ اس زبان نے نہ شاہانہ اقتدار کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا اور نہ کسی دور میں غیروں کا سرمایہ نظر بنی، عوامی زندگی میں اس کا روپ نکھرا اور اسی کی تنومندی ظاہر ہوئی۔ شاہی محلوں سے پہلے خدا پرست صوفیوں کی خانقاہیں اس کی جوت سے جگمگائیں۔ شاہی محلوں میں یہ زبان نئی عوامی ہندی تہذیب کی فتح کا اعلان کرتے ہوئے داخل ہوئی۔ اردو ادب نے شمال سے پہلے دکن میں جنم لیا۔ اس سلسلہ میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بہمنی اور قطب شاہی و عادل شاہی سلطنتیں جو اردو ادب کی ترقی و ترویج کا گہوارہ بنیں، ہندوستانی تہذیب کی ترقی اور خدمت کا ایک واضح تصور رکھتی تھیں اور ان کے عروج میں ہندوستانیت کو کئی حیثیتوں میں فروغ اور نکھار حاصل ہوا۔ شمالی ہند میں اردو عوام ہی کے سہارے پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی۔ لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ شمالی ہند میں اردو ادب کچھ عرصہ فارسی سے بہت قریب ہو کر رہا۔ لیکن اس سے زبان کا سانچہ بدل سکتا تھا۔ اور نہ بدلا۔

اردو ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ یہیں کی آب و ہوا نے اس کے بدن کو توانائیِ زندگی۔ اس کے چہرے کو نکھارا۔ اس کے جوہر کو نکھار

اور اس کے ماتھے کو حسن کی جودت دی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا۔ کہ زبان کبھی کبھی اپنی بڑی کی خاصیت کو چھوڑ دیتی۔ تشبیہ، استعارہ، تمثیل اور ادب کے دوسرے زیورات بے شک شیراز و اصفہان سے مستعار لے لئے گئے ہیں۔ لیکن ادب و نفسیات کا کوئی بھی سنجیدہ طالب علم کیا کہہ سکتا ہے کہ ان کے واسطے سے جس ذہن نے نمود پایا ہے وہ ہندوستانی نہیں؟

پٹھانوں اور مغلوں کے دور میں ہندوستان کی بولیوں کو جو زبردست ادبی فروغ حاصل ہوا ہے۔ وہ تاریخ کی ایک روشن حقیقت ہے۔ ان زبانوں کا فروغ و ترقی اس امر کو صاف ظاہر کرتا ہے کہ عمومی طور پر مسلمان فرمانرواؤں کی پالیسی ہندو مسلمانوں کے سموئے ہوئے تمدن کو پروان چڑھانے میں معاون رہی۔ مسلمان فرماں رواؤں کے دور میں کسی قسم کے لسانی فراغ کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ گراں بہا عطیہ بھی ہم کو فرنگی حکومت کے دربار سے ملا کر زبان کے ساتھ سیاسی قسم کی مذہبی عصبیت وابستہ ہو گئی۔ لیکن ان سیاسی چال بازیوں کے باوجود اردو کی ہمہ گیر ہندوستانی حیثیت میں کبھی کبھی فرق نہ آیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب علمی اور ادبی حیثیت سے اردو کی باقاعدہ تنظیم اور ترقی کے جا کے بنے تو ان میں رنگ آمیزی۔ ہندو اور مسلمان دونوں کی موقلم نے کی حالی۔ شبلی اور آزاد کے ساتھ سرور، سرشار، اور چکبست کے نام کبھی بھی تاریخ سے نہیں مٹائے جا سکتے ہیں یہ ماننے میں قطعاً تامل نہیں ہے کہ شمالی ہندوستان میں اردو ہی مسلمانوں کی مادری زبان رہی

ہے - اور آج بھی رہی ہے - لیکن اس سے یہ نتیجہ کسی طرح بھی نہیں نکلتا کہ اردو ہندوستان کی دشمن ہے - جدید اردو ادب نے خالص ہندی قومیت کی نمو و ترقی میں جو حصہ لیا وہی اس امر کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اردو کی نگاہ میں ملکی مفاد کی اہمیت کبھی بھی کم نہیں رہی ہے - ادب ایک خطۂ زار ہے - جہاں گلہائے صد رنگ ظہور کرتے ہیں - دنیا کی کوئی زبان تمام تر ایسا ادب پیش نہیں کر سکتی - جو قوم پرستی کے خیالات سے مملو ہو پھر ایک ایسا معیار قایم کر کے اردو کو ہدف ملامت بنانا نہ انصاف ہے - نہ دانشمندی، صحیح طریقہ یہ ہے - کہ دیکھا جائے کہ اردو زبان و ادب میں زندہ رہنے کی طاقت آج بھی موجود ہے یا نہیں! اس کے ادیب اور شاعر تغیر پذیر حالات کو نگاہ میں رکھ کر برابر اصلاح کے لئے کوشاں رہے ہیں یا نہیں! اور اس کے عروج و ترقی سے نئے ملکی تمدن کو خاطر خواہ فائدہ پہنچنے کا امکان ہے یا نہیں؟

یہ ہے سنجیدہ معیار جس پر کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے - اردو زبان و ادب پر سرسری نگاہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بڑھتی اور پھیلتی ہوئی زبان ہے - اس نے جہاں جہاں سے ہو سکا ہے قوت و زندگی حاصل کی ہے - عوام و خواص سب اس کو بولتے ہیں - کاروباری زندگی میں اس کا چلن ہے - تفریح و نشاط کی دنیا میں اس کے زمزموں سے معمور ہے - ۱۸۵۷ء کے بعد سے بالخصوص اس زبان میں سادگی پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے - سرسید نے سادہ نگاری کی ایک طاقتور روایت قائم کی -

حالیؔ نے اس کو ادبی استحکام بخشا، اور ادیبوں اور شاعروں کی ایک پوری جماعت ہے۔ جو تقسیم ہند سے بہت پہلے اسے ہندی کے قریب تر کرنے میں برابر مصروف عمل رہی ہے۔ یہ بے نظیر اور بے حوصلہ یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ آج ہم تعمیر نو کا کام واضح منصوبہ بندی کے ماتحت کر رہے ہیں۔ ملکی زندگی کا کونسا ایسا شعبہ ہے جس میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت نہیں اس حیثیت سے اگر اردو زبان و ادب کے متعلق بھی نیک نیتی سے کچھ اصلاحیں تجویز کر دی جائیں تو بہت معقول اور کارآمد بات ہوگی۔ حیرانی تو اس وقت ہوتی ہے۔ جب متضاد دلائل کے حربے لئے مختلف سمتوں سے نعرے بازی کے جوش میں میدان سیاست کے کام گاران وقت اردو پر پل پڑتے ہیں۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے۔ اردو کو نکال دو، یہ بدیسی زبان ہے۔" دوسرے بزرگ کا ارشاد ہوتا ہے۔ "اردو سرے سے کوئی زبان ہی نہیں ہے۔" ہندی کا ایک اسلوب بیان ہے۔"

"تیسری طرف سے صدا اٹھتی ہے۔" یہ شوریدہ بخت مسلمان بادشاہوں کے محلوں کی لونڈی ہے۔ اس لئے گردن زدنی ہے۔" بعض وقت ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ معترض صاحبان اعتراضات کو ایک ساتھ رکھ کر غور کرنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے کہ یہ کھلونے آپس میں ٹکرا کر ٹوٹ جائیں۔ اور ان کا ذہن الجھاؤ سے پاک ہو جائے۔ پچھلے پندرہ برس میں اردو کے مخالفوں نے جس تیزی کے ساتھ اپنے محاذ بدلے ہیں اور استدلال کے ترکش سے جس جس انداز

نے تیر لگائے ہیں۔ اس سے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا ہنگامہ سیاسی شعبدہ گری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اردو کی بقا زندگی کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے۔ کہ اس کے مخالفوں کے پاس کوئی ایسا حربہ نہیں ہے۔ جو واقعی کارگر ہو۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دماغ میں زبانوں کے ارتقاء کا کوئی واضح تصور ہے نہ تہذیب و تمدن کی خاکہ بندی کا کوئی خاص نظریہ، نہ حال پر کوئی روشن نظر ہے۔ اور نہ مستقبل کے متعلق کوئی سائنٹفک قیاس آرائی ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ کہ ہندوستان کی ترقی بلند نظر ہم رنگی سے ممکن ہے تنگ نگاہ و یک رنگی سے ممکن نہیں۔ یہ امر موجب اطمینان ہے کہ ملک کے صحیح الخیال افراد یہ خوشی کی بات ہے کہ ان کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ان معاملات میں واضح اور صاف رائے رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ جمہوریت کو ایک طرز زندگی کی حیثیت سے اس کی کامیابی چاہتے ہیں۔ کبھی بھی اس کیلئے تیار نہیں ہو سکتے کہ کسی بھی تہذیبی اور تمدنی متاع محض موہوم تعصب اور مبہم گمان فاسد کی بنیاد پر فنا کر دیا جائے۔ اردو کی زندگی کا یہ روشن ثبوت ہے کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں اسے ایک زندہ زبان کی حیثیت سے ملک کی مسلمہ علاقائی زبانوں میں جگہ ملی ہے۔ یہ دستور سند اردو کی زندگی اور بقا کے لیے محکم ترین آئینی قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی اہمیت کو ہمہ وقت نگاہ میں رکھنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ خالص جمہوری انداز میں جدوجہد کی بنیاد یہی آئینی سند فراہم کرتی ہے۔

اردو کی آئینی حیثیت تسلیم کی جا چکی ہے۔ پھر بھی ایک مہنت

قسم کے ابتلا و آزمائش سے اس کا سامنا ہے۔ ہندوستان کے لئے وہ خطے جہاں صدیوں اس کا بول بالا رہا ہے۔ آج اس کے لئے امتحان گاہ بنے ہوئے ہیں۔ اردو سے محبت رکھنے والوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اسے اچھی طرح نگاہ میں رکھیں۔ کہ اردو کے حق میں سب سے بڑی قوت خود اس کی زبان و ادب کی صلاحیت ہے۔ اس کی صلاحیت کا جس قدر عرفان بڑھے گا اتنا ہی پایانِ کار اپنی کامیابی کا یقین بڑھے گا۔ اردو کے حق میں یہ بہت اچھی بات ہے کہ اردو دوستوں نے اس دور میں بڑے صبر و تحمل لیکن بڑے عزم و ہمت کے ساتھ ناساز گار حالات کے مقابلہ کرنے کی کوشش کی انجمن ترقی اردو نے اتر پردیش میں دستخطی مہم چلا کر دستوری طرز پر جد و جہد کرنے کا ایک بہت معقول نمونہ نگاہوں کے سامنے پیش کر دیا۔ فی الحال انجمن کے زیر نگرانی مادری زبان میں حصول تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے جو جد و جہد ہو رہی ہے۔ وہ بہت قابل لحاظ ہے۔ گرم مزاج اور شعلی طبیعت رکھنے والے لوگ ان اقدامات کو بہت ناکافی سمجھتے ہیں۔ ان کے جذبہ کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ لیکن یہ چیز نگاہ میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ پائیدار تعمیری کام قدم قدم یہ قدم ہر لحظہ بہ لحظہ ہی انجام پاتا ہے۔ اردو کی مہم کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے بڑے ٹھنڈے دل و دماغ اور بڑے محتاط اقدام کی ضرورت ہے۔ گرم مزاجی اور اشتعال میں قدم صحیح کبھی نہیں پڑتے بلکہ اکثر بہک جاتے ہیں۔

اردو کے سامنے اس وقت بہت سی دقتیں ہیں آئینی حیثیت

سے وہ تسلیم شدہ زبانوں میں ہے۔ لیکن اسکولوں اور کالجوں میں اس تعلیم کا باقاعدہ بندوبست نہیں عدالتوں اور دفتروں سے قریب قریب اس کا اخراج ہو چکا ہے۔ انگریزی بدیسی زبان ہے۔ پھر بھی ملکی زندگی میں اس کا خاصہ عمل دخل ہے۔ تعصب کی وجہ سے حکام اکثر اردو کو دبانے اور اجتماعی زندگی سے خارج کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ایک زندہ زبان کا سوال ماں کی گود سے لے کر اجتماعی زندگی کی۔ اعلیٰ ترین تنظیم تک پھیلا رہتا ہے۔ اور اگر کسی منزل پر بھی اس کے جائزہ مفاد کو نقصان پہونچ جائے تو اس کی ترقی کی صحیح رفتار میں رخنے پڑ جاتے ہیں۔ اسی لیے اردو کے قیام و بقا کا سوال ہمہ گیر جدوجہد کا نقشہ لگا ہوں کے سامنے لے آتا ہے۔ صحیح اور تشفی بخش علاج وہی ہے۔ جو انجمن ترقی اردو نے اردو بولنے والے خطوں اور صوبوں میں اسے علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کرانے کے لئے پیش کیا ہے، یوپی، بہار، دلی اور پنجاب میں جہاں اردو تقسیم کے وقت مکمل اجتماعی زندگی میں پورا عمل دخل رکھتی تھی۔ دوبارہ اس کی ساکھ قائم ہونے کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ کہ ان خطوں میں اسے علاقائی زبان کی حیثیت مل جائے اس طرح وہ سرکاری زبان ہندی کے دوش بدوش خاطر خواہ ترقی کر سکے گی۔ اور لسانی اور ادبی حیثیت سے ہندی اور اردو دونوں زبانیں اس سے بہت فائدہ اٹھائیں گے۔ علاقائی زبان کی مہم کے ساتھ جزوی معاملات کے تصفیہ کی کوشش ہو رہی ہیں۔ وہ اپنی جگہ بالکل مناسب ہیں لیکن

ان کوششوں سے نہ صرف ذوقِ عمل تازہ رہتا ہے۔ بلکہ کام کرنے کا تجربہ بھی برابر نکھرتا جاتا ہے۔

کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ چیز بھی بہت اہم ہے کہ پچھلے آٹھ دس برس کے عرصہ میں بتدریج فضا کا رنگ بدلا ہے۔ گرد و غبار ہٹا ہے۔ اور مسائل کچھ روشن ہو کر سامنے آئے ہیں۔ ایسے زمانے میں ان لوگوں کے فرائض جو اردو کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ بے انتہا بڑھ جاتے ہیں۔ صبر و ہمت کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر پر جمے رہنا۔ اور اپنے دائرے میں زبان و ادب کے فروغ و ترقی کے لئے سرگرمِ کار رہنا ایک اہم فرض ہے۔ جس کی خاطر خواہ انجام دہی پر ہی مستقبل کا انحصار ہے۔ یہ ہندوستان نے جمہوری طرزِ زندگی کو قبول کر کے یہ مان لیا ہے۔ کہ ملک کی مختلف تمدنی اور لسانی وحدتیں نشو و نما اور بالیدگی کا پورا حق رکھتی ہیں۔ اگر ہم بصیرت، تندرستی اور صبر و استقامت کے ساتھ اپنے تخیل پر قائم رہیں گے۔ تو ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ جمہوری روایات کے استحکام کے ساتھ اردو کی اعلیٰ ترین ترقی کے لئے زمین ہموار ہوتی جائیگی۔ ہمیں اس معاملہ میں اپنی نظر بالکل صاف رکھنا چاہیئے کہ اردو کی خدمت وسیع مفہوم میں ہندی کی تعمیر نو کے لئے ایک موثر اقدام کی حیثیت رکھتی ہے۔

تقسیم ہند نے قومی زندگی میں ایک بدنظمی سی پیدا کر دی ادب اور خصوصی طور پر اردو ادب کی ترقی کو اس سے بڑا دھکا لگا۔ دو علیحدہ گھوارے قائم ہو گئے۔ آگ اور خون کے بے تحاشا ہولنے

ذہنوں کو ماؤف اور روحوں کو پژمردہ کر کے رکھ دیا۔ اخلاق اور ادب اور خصوصی طور پر اردو ادب کی ترقی کو اس سے بڑا دھکا لگا۔ دو علیحدہ گہوارے قائم ہو گئے۔ آگ اور خون کی لمبے تماشا شولہ نے ذہنوں کو ماؤف اور روحوں کو پژمردہ کر کے رکھ دیا۔ اخلاق اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں سے ایمان اٹھ گیا۔ تہذیب کی رفتار ترقی میں فرق آیا۔ ادب میں ایک خلا نظر آنے لگا۔ کشت و خون کے عظیم حادثوں کے نتیجہ میں ایسا ہو جانا بالکل فطری امر ہے۔ لیکن اس سے یہ سمجھ لینا کہ یاس و عدم اعتماد کی پرچھائیاں مستقل طور پر ڈیرے ڈالے رہیں گی صحیح نہیں ہے ادب کی تاریخ بتاتی ہے کہ عبرت کے مناظر اور کشت و خون کی ہولیاں عارضی طور پر تو بے شک ذہن و روح کو منتشر کر کے رکھ دیتی ہیں۔ لیکن ان کے اثر سے فکر و عمل کے احتساب کا ذوق قوی تر ہو جاتا ہے۔ اور انسانی فطرت کا بنیادی جوہر نمود زیادہ تابناکیوں کے ساتھ ہویدا ہوتا ہے۔ ہمارے دور میں جو زبردست تہذیبی زلزلہ آیا ہے۔ اس نے زندگی کے بنیادی سوالات کو ابھار کر سامنے کر دیا ہے۔ یہ سوالات ناحق تدبیر سے اعجاز عقدہ کشائی طلب کر رہے ہیں۔ اور نگاہ بصیرت سے زندگی کی رمز شناسی، اگر ہم ماحول پر قابو پا گئے۔ اور آثار برابر اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ تو یہ چیز بالکل یقینی ہے کہ اس دہکتے ہوئے لاوے سے وہ جوت پھوٹ پڑے گی، جو ادب اور زندگی کا نور بن جائے گی یہ امر حوصلہ آفریں ہے کہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں نے اس فتنوں سے بھرے ہوئے زمانے

میں یقین کی شمع کو روشن رکھا ہے اور اپنی حد لبساط تک زبان و ادب کی خدمت میں برابر مصروف رہے ہیں۔ ادب کے کاروبار میں تعطل کبھی نہیں آیا۔ شاعروں کی زمزمہ سنجیاں، نقادوں کی نکتہ آفرینی اور ادیبوں کی خیال آرائیاں آج بھی رنگ و کیف کے ساتھ نکھار پر ہیں وقت کے ساتھ ساتھ قومی زندگی میں یاس و حرمان کی کیفیت جس قدر کم ہوتی جا رہی ہے اور تعمیر و ترقی کی لگن جس قدر بڑھتی جا رہی ہے۔ ادبی تخلیق کے دروازے کھلتے جا رہے ہیں۔ ادب کے پرانے ذخیروں کو کھنگالنے کا شغف برابر بڑھ رہا ہے۔ اور ادبی تاریخ کی گمشدہ کڑیوں کی فراہمی کے لئے تیز تر جد و جہد جاری ہے۔ انفرادی کوششیں اپنی جگہ بہت قابل لحاظ ہیں لیکن بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اجتماعی پیمانہ پر بھی اچھا کام ہو رہا ہے۔ انجمن ترقی اردو، دار المصنفین اعظم گڑھ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی اور بہت سے ادارے واضح مقاصد کے تحت کام میں لگے ہوئے ہیں۔ ان اداروں کے زیر نگرانی لسانی تحقیق اور ادبیات کے مختلف میدانوں کی سیرابی کے لئے برابر سرگرم ہو رہے ہیں۔ ۱۹۴۷ء کے انقلاب نے زندگی کے معاملات میں کچھ کم و بیش تبدیلیاں پیدا کیں ممتاز ادارے نئے حالات میں معطل ہو کے رہ گئے اور بعض کے خدمت و عمل کے دائرے سے اردو بالکل خارج ہو گئی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ اور ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اردو کی جو زبردست خدمت انجام دی ہیں وہ تاریخ کے صفحات

سے کبھی محو نہیں ہو سکتیں۔ جدید اردو ادب کی تعمیر میں علی گڑھ تحریک نے
جو نمایاں حصہ لیا ہے وہ تاریخ ادب کا ایک بہت اہم باب ہے۔ سرسید
احمد خاں اور ان کے ساتھیوں نے صحیح معنی میں جدید اردو ادب کی بنیاد رکھی
اور اس کے فروغ اور ترقی کے میدان پیدا کئے۔ علی گڑھ اس ستر بچھتر
برس کے زمانے میں برابر اردو کی ترویج و اشاعت اور ادبی استحکام و بالیدگی کا گہوارہ رہا ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجہ میں جو تغیرات رونما ہوئے انہوں
نے اردو کے اکثر مرکزوں کے وقار کو شدید طور پر مجروح کر دیا۔ دلی اور
حیدرآباد بالکل سامنے کی مثال ہیں۔ علی گڑھ کی مرکزیت نہ صرف قائم
ہے بلکہ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ اندازہ ہوتا ہے۔ کہ اردو ادب
کی آئندہ تعمیر و ترقی کے سلسلے میں علی گڑھ کو ایک بار پھر بہت
نمایاں کام کرنا ہے۔ اردو داں طبقہ علی گڑھ سے جو امیدیں وابستہ
کرتے ہیں وہ بالکل جائز ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ علی گڑھ کے ارباب
حل و عقد کو اس ضرورت کا پورا احساس ہے۔ اور اس کے روشن
امکانات نگاہوں کے سامنے موجود ہیں۔ کہ مسلم یونیورسٹی میں بہت
وسیع پیمانے پر ادبی و تحقیقی کام کے منصوبے مکمل ہو جائیں گے۔

زبان و ادب کے سلسلہ میں مختلف نظریاتی تحریکوں کی کاوش جد و جہد
کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا نام ترقی پسند تحریک کا آتا ہے۔
نظریہ سے بحث کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس تحریک
کی بدولت خصوصی طور پر نوجوان طبقے میں ادبی مطالعے اور تنقید و
تصنیف کا ذوق و شوق برابر بڑھ رہا ہے۔ مذہبی اور روحانی احساس
کو مدنظر رکھ کر تعمیر پسند ادب کی تحریک ادیبوں اور شاعروں کیلئے

ایک نئی مرکزیت پیدا کرنے کیلئے سرگرم کار ہے۔ یہ تحریک ابھی بالکل ابتدائی منزلوں میں ہے۔ بآسانی اس کے مستقبل کے متعلق پیشن گوئی نہیں کی جاسکتی لیکن زبان وادب کے ہمہ گیر جائزہ میں اس مسلمہ کو نگاہ میں رکھنا ہر قیمت ضروری ہے۔ ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن

یہ تبصرہ نامکمل رہ جائے گا جامعہ اردو علی گڑھ کا ذکر نہ کیا جائے جامعہ خاموش خدمت اور استقامت پسند عمل کا ایک روشن مظہر ہے اس کی روز افزوں مقبولیت ظاہر کرتی ہے کہ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں اردو کی پوزیشن عوامی زندگی میں کتنی مستحکم ہے۔ اور اردو زبان وادب کے حاصل کرنے کا شوق کس قدر نمایاں ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ راہ کانٹوں سے بھری ہے پریشانیاں اور دقتیں کم نہیں ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ کام کرنے کا میدان بھی موجود ہے اور اس لطف کی بھی فراوانی ہے جو مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرکے ہی حاصل ہوتا ہے عزم و استقامت کو ایسے ہی حالات میں پر پرواز ملتے ہیں اور ایسے ہی ماحول میں ذوق عمل کو برابر یہ نوائے حیات مہمیز کرتی ہے ؎

لے چل ہاں منجدھار میں لے چل ساحل ساحل کیسا چلنا

میری اتنی فکر نہ کر میں خوگر ہوں طوفانوں کا





